محمد

بن

عبد الوہاب

مسعود عالم ندوی

محمد بن عبد الوهاب

محمد بن عبدالوہاب

مسعود عالم ندوی

مکتبہ چراغِ راہ کراچی

قیمت : تین روپے
ناشر : مکتبہ چراغ راہ • کراچی
طابع : اردو پریس • لاہور

اِنتساب

اپنے استاذ، مرّبی اور مخدوم

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحؒ

کے نام

جن کی پدرانہ شفقت میری زندگی کے اتار چڑھاؤ کی نگہبان رہی ہے اور جن کی سرپرستی اور قیمتی مشوروں نے مجھ میں لکھنے پڑھنے کا مذاق پیدا کیا، اور اپنی طالب علمی کے گزشتہ بارہ تیرہ برسوں میں جن کی ہدایتوں کا یکسر پابند رہا ہوں،

اس حقیر طالب علمانہ کوشش کو معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں

پٹنہ
۲۰، ربیع الآخر ۱۳۶۱ھ

خاکسار
مسعود عالم ندوی

طابع   اردو پریس لاہور

باہتمام   علی محمد چوہدری

ناشر   مکتبہ چراغ راہ، کراچی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع چہارم

محمد بن عبد الوہاب: ایک مظلوم اور بدنام مصلح، پہلی مرتبہ اس طرح چھپی (حیدرآباد ۱۳۴۶ھ) کو دیکھ کر سخت تکدر ہوا اور غلط نامہ لگا کر دل کو تسکین دینا پڑی۔ دوسری اشاعت بھی حیدرآباد (دکن) ہی سے ہوئی (۱۳۴۷ھ) کاپیوں کی تصحیح خود اپنے ذمہ لی۔ اس لیے غلطیاں بہت کم ہوئیں، مگر تصنیفی حیثیت سے کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء میں نجد اور ریاض کی زیارت کا موقع ملا، تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتاب کے بحث طلب حصوں کی تحقیق کی۔ شیخ محمد بن عبد الوہاب کے خاندان کے ممتاز علماء سے مذاکرے ہوئے۔ خاصہ مواد ملا۔ اپنی چھان بین کی جانب سے بھی اطمینان ہوا۔ خاص طور پر علمائے آل الشیخ کی مکمل وفیات شیخ محمد بن ابراہیم[1] کے کاتب خاص نے ان کی بیاض سے املا کرا دی۔ مگر اتفاق کہ میری واپسی سے پہلے ہی کتاب کی تیسری

---

[1] شیخ محمد بن ابراہیم بن عبد اللطیف بن عبد الرحمان بن حسن بن محمد بن عبد الوہاب اس وقت نجد کے سب سے بڑے عالم و فقیہ اور مفتی اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حکومت اور قوم، دونوں کی نگاہوں میں قاضی القضاۃ سے بھی ان کا مرتبہ بلند ہے۔ مادر زاد نابینا ہیں۔ عجیب و غریب حافظہ پایا ہے۔

اشاعت مکمل ہو چکی تھی (نومبر سنہ ۴۹ء) اس لئے نئی معلومات سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔

اب تقریباً چار پانچ سال کے بعد نظرِ ثانی کا موقع ملا، تو وہ یادداشتیں کام آئیں اور مقدور بھر کتاب مکمل ہو گئی۔ پاکستان میں کاغذ کی کم یابی کو دیکھتے ہوئے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ منقح اڈیشن کب تک شائع ہو سکے گا۔ پر اپنے اطمینان کے لئے اتنا کافی ہے کہ یہ سطریں لکھ کر منقح و مصحح نسخہ اپنے ناشروں کے حوالہ کر رہا ہوں۔ اللہ کرے، زیادہ تاخیر نہ ہو۔

۲۰ جمادی الاولیٰ سنہ ۷۳ھ

عاجز
مسعود عالم ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریب

(۱)

قدرت کے کارخانے بھی عجیب و غریب ہیں، لکھنے والے نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک تجدید و امامت اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی سرگذشت قلم بند کرنا چاہی اور مرتب ہو گئی شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کی سیرت۔ اِس عجیب و غریب واقعے کی مختصر سرگذشت یہ ہے کہ ۳۵ھ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دو طالب علموں نے یہ ارادہ کیا کہ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ (رحمہما اللہ رحمۃ الابرار الصالحین المجاہدین من عبادہ) کی چلائی ہوئی تحریک تجدید و امامت کی مکمل تاریخ مرتب کی جائے۔ ایک نے حضرت سید صاحبؒ کی سیرت اپنے ذمہ لی اور دوسرے نے بالاکوٹ کے مشہد سے اپنا سفر شروع کرنے کا ارادہ کیا۔

دونوں نے اپنا اپنا کام شروع کیا۔ ان میں جو باہمت، صاحب دل اور سراپا اخلاص و جہاد تھا، اُس نے سیرت سید احمد شہید مرتب کر لی (۳۹ھ)، میرا اشارہ

اپنے مخلص دوست مولانا ابوالحسن سید علی حسنی ندوی (استاذ تفسیر و ادب دار العلوم ندوۃ العلما) اور ان کی تصنیف سیرت سید احمد شہید کی طرف ہے، جو اہلِ ذوق کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے اور ایک قلیل مدت میں اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

دوسرے (راقم) نے بھی اپنا کام شروع کیا، لیکن قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آئیں۔ نشانِ راہ دھندلا ہو چکا تھا، جاننے والے اور دیکھنے والے ابدی نیند سو چکے تھے۔ سننے والوں پر اب تک ہیبت طاری ہے۔ لیکن قلم کا مسافر اپنی منزل کو نہیں بھولا۔ تلاش و جستجو کے ابتدائی نمونے مرحوم "الضیاء" (شعبان ۵۲ھ) میں "الحرکۃ الوھابیۃ السیاسیۃ" کے عنوان سے، اور "البلال" پٹنہ میں "وہابیت: ایک دینی اور سیاسی تحریک" کی سرخی کے تحت شائع ہوئے اور مخصوص حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے۔

دورانِ بحث و تحقیق میں نجد کی وہابی تحریک (جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے) کا ذکر بار بار نظر سے گزرا اور ایسی غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں سے دوچار ہوا کہ یارائے ضبط نہ رہا۔ سب سے بڑی غلط فہمی، جس میں دوست اور دشمن دونوں مبتلا ہیں، یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک وہابیت یعنی حضرت سید صاحبؒ کی تحریک تجدید و امامت نجد کی وہابی تحریک ہی کی ایک شاخ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں تحریکوں کا ماخذ ایک، مقصد ایک اور دونوں کے چلانے والے کتاب و سنّت کے علم بردار اور یکساں سرگرم مجاہد تھے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر بالکل اٹل ہے کہ ایک کا دوسرے سے دور کا بھی تعلق نہیں یعنی ایک نے دوسرے کی تعلیمات سے بالکل فائدہ نہیں اٹھایا۔ دونوں

دعوتیں، الگ الگ اپنے مخصوص ماحول اور حالات کے مطابق پھلیں پھولیں۔ اس لئے اصولی اتحاد (یعنی کتاب و سنّت کی طرف لوٹنے کی دعوت) کے باوجود دونوں پر اپنے اپنے مخصوص مقامی اثرات کی چھاپ بھی محسوس ہوتی ہے۔ اور جزئیات میں ایک دوسرے سے کافی اختلاف بھی رکھتی ہیں۔

ہم نے ابھی کہا کہ نجد کی تحریک دعوت و تجدید کے متعلق ایسی غلط بیانیاں نظر سے گزریں، کہ یارائے ضبط نہ رہا اور اسی لیے اختیاری میں عاجز نے زیرِ ترتیب کتاب کے دو حصّے کر دیئے۔ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی کی سیرت اور دعوت سے متعلق یہ صفحے، اس مجوزہ کتاب کی پہلی جلد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری جلد ہندوستان کی تحریک تجدید و جہاد کی مکمل تاریخ پر مشتمل ہوگی، جس میں حضرت سیّد صاحب کی شہادت (۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء) سے لے کر ۱۸۷۱ء تک کی تمام سرگرمیوں، قربانیوں اور خدمات کا گہرا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

(۲)

اس سلسلے میں ایک چیز کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے "نجدی وہابیت" یا "ہندوستانی وہابیت"[1] کی تاریخ مرتب کرنے سے ہماری غرض اس بات کی تبلیغ نہیں کہ حق و صداقت ان ہی دو لوگوں جماعتوں میں محدود ہیں، یا یہ کہ مختلف ادبی و مذہبی "دبستانوں" کی طرح، ان جماعتوں کو ہم ایک خاص مشرب یا "دبستان" کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان جماعتوں کے بعض سرگرم داعیوں یا پرجوش معتقدوں کا ایسا خیال ہو۔

---

[1] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک

لیکن ہم اس "تحزب" کو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں حد درجہ مُضر سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک حق صرف کتاب و سنت کی پیروی میں ہے۔ ہم رشد و ہدایت کو کسی فقہی[1] مذرسی، یا ملکی جماعت کا اجارہ نہیں سمجھتے۔ یہ نہ نجد کی زرخرید ہے، نہ ہندوستان کی۔ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات واضح اور نمایاں ہیں، جو ان پر ٹھیک ٹھیک چلے گا، وہ ہدایت و فلاح سے شاد کام ہوگا۔

نجد اور ہندوستان کی ان دونوں جماعتوں کی تاریخ مرتب کرنے اور اُن کے دھندلے نقوش کے اُجاگر کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری کے دو مشہور مصلحوں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کی سیرت ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے۔ ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ ان صدیوں میں صرف یہی دو مُصلح پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴ - ۱۱۷۶ھ) اور طرابلس میں محمد بن علی سنوسی (۱۲۰۲ھ ۱۷۸۷ء - ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء) بھی اپنی شان تجدید و اصلاح کے لحاظ سے انتہائی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ گو کہنے والے کہیں گے کہ سید صاحبؒ کی دعوت حضرت شاہ صاحبؒ ہی کی پکار کی آواز بازگشت تھی۔ مگر یہ مان لینے کے بعد بھی سید صاحبؒ کا خاص رنگ اور انفرادی خصوصیات اپنی جگہ پر باقی رہتی ہیں۔ اسی طرح اصلاح و تجدید کے دوسرے رنگ میں سید جمال الدین افغانی (ف ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۷ء) اور امیر عبدالقادر جزائری (ف ۱۳۰۰ھ ۱۸۸۳ء) بھی ایک بڑی جماعت کی عقیدت و محبت کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور بجا طور پر۔

---

[1] یعنی ہم "حق" کو ائمہ اربعہ کی تقلید میں محصور سمجھتے ہیں، نہ دیوبند، نہ بریلی ندوہ کے شیوخ، اور اکابر کی پیری میں اور نہ پیشوائی کو کسی خاندان یا ملک کا موروثی حق خیال کرتے ہیں۔

اسی طرح ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ نجد اور ہندوستان کی یہ دونوں جماعتیں معصوم ہیں اور ان سے غلطیاں اور کوتاہیاں نہیں ہوئیں - اہلِ نجد کے بارے میں تو غلو اور شدت کا شکوہ دوستوں کو بھی ہے - ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ یہ مخلص جماعتیں تھیں، جو اللہ کے نام پر اٹھیں اور جہاں تک انسانی کوششوں کا تعلق ہے، اعلاء کلمۃ اللہ میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی - آپ اس نظر سے ان کے کاموں کا جائزہ لیجئے - سُنی سنائی باتوں پر دشمنوں اور جاہل مولویوں اور صوفیوں کے پروپگنڈے سے متاثر ہو کر غلط رائے قائم کر لینا طالبِ حق کا شیوہ نہیں ہو سکتا -

ہم نے اس کتاب میں "رائے زنی" سے مقدور بھر احتیاط برتی ہے - امکانی چھان بین اور زیادہ سے زیادہ مستند مآخذ کی بنیاد پر ہم نے حالات و معتقدات کے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے - اگر کامیابی ہوئی، تو یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے؛ ورنہ ایک بے برگ و نوا طالب علم سے غلطیوں اور فروگذاشتوں کا رہ جانا بعید نہیں -

آخر میں، اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ نیت و عمل میں اخلاص اور اس حقیر کوشش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے - آمین

پٹنہ
۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ

عاجز
مسعود عالم ندوی

عرضِ مؤلف

زیرِ نظر کتاب کی ترتیب کا کام عاجز نے شوال ۱۳۵۹ھ (نومبر ۱۹۴۰ء) ہی میں شروع کر دیا تھا، لیکن ملازمت کی مشغولیت کے باعث زیادہ وقت نہ دے سکتا تھا، تاہم آہستہ آہستہ کام ہوتا گیا اور شوال ۱۳۶۰ھ (نومبر ۱۹۴۱ء) میں کتاب کا خاکہ تیار ہو گیا۔ مگر کتابوں کی کمی کے باعث مسودہ مکمل کرنے کی ہمت نہ ہوئی، اور جب کچھ لکھا، تو کچھ اور مواد ملنے پر کافی اصلاح و ترمیم کی ضرورت پڑی۔ پھر بھی انتہائی تلاش و جستجو کے باوجود بعض ضروری اور اہم کتابیں نہ مل سکیں، جن کا ذکر مآخذ کے ضمن میں آگیا ہے۔

جن بزرگوں اور دوستوں نے کتابوں کی فراہمی اور اُن کا پتہ دینے میں ہماری مدد کی، ہم اُن کے دل سے شکر گذار ہیں۔ اس سلسلے میں خاص طور پر جناب ڈاکٹر عظیم الدین صاحب پٹنہ، پروفیسر سید حسن عسکری پٹنہ، مولانا عبد الرحمٰن کاشغری ندوی، کلکتہ، مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی لاہور، ڈاکٹر شیخ محمد عنایت اللہ صاحب لاہور، ڈاکٹر

محمد حمید اللہ صاحب، حیدر آباد، شرف الدین واو لاوڈ، بمبئی، مولانا عبد المجید صاحب حیدری، بنارس۔ پروفیسر محمد اکبر ندوی، کلکتہ یونیورسٹی، حکیم حافظ یوسف حسن خان صاحب، بہار شریف (پٹنہ) کا دلی شکریہ ادا کرنا میرے لئے ایک خوشگوار فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ اگر ان بزرگوں اور دوستوں کی مدد نہ ہوتی، تو متعدد کمیاب اور نایاب کتابوں کا جمع کرنا میرے لئے بہت دشوار ہوتا۔

اس موقع پر ایک نجدی عالم[۱] شیخ محمد عمران بن محمد بن عمران (ساکن ریاض۔ نجد) کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے بمبئی میں اس کتاب کی تالیف کا حال سن کر پہلے سلام محبت سے یاد کیا، پھر بنارس ہوتے ہوئے پٹنہ تشریف لائے اور دو دن غریب خانہ کو رونق بخشی۔ وہ اوسط درجہ کے لکھے پڑھے آدمی تھے، لیکن شیخ ابن عبد الوہابؒ کے ساختہ و پرداختہ نجد کے ایک فرد۔ وہی اتباع سنت، وہی تقویٰ، وہی جوشِ عمل جو اس جماعت کا طرۂ امتیاز سنتے آئے ہیں۔ کم از کم ہندوستان میں اس درجے کے اشخاص بہت کم دیکھنے میں آئے —— ان سے ہمیں بہت مدد ملی۔ متاخرین علمائے نجد کے سنین وفات کی تعیین انہوں نے اپنے حافظہ سے کی اور پورے یقین کے ساتھ۔ پھر بھی جہاں کہیں ہم نے ان کی روایت پر اعتماد کیا ہے، حوالہ دے دیا ہے۔

۱؎ یہ سطریں سنہ ۴۲ھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ سنہ ۴۹ء میں ریاض (نجد) کی زیارت کا موقع ملا اور شیخ محمد عمران صاحب سے بھی تجدید ملاقات ہوئی۔ وہیں اہل علم سے مذاکرہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان کی بتائی ہوئی وفیات سب صحیح نہیں تھیں۔ اس اڈیشن میں ان کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

(ب)

کتاب کے مطالعے کے دوران میں مندرجہ ذیل گذارشیں پیشِ نظر رہیں، تو راقم کی ممنونیت کا باعث ہو گا۔

۱۔ حوالوں میں طوالت سے بچنے کے لئے بسا اوقات صرف مُصنّف کے نام پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کتابوں کی تعیین مآخذ سے ہو سکے گی۔

۲۔ ہجری اور عیسوی سنین کے تطابق کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے، لیکن جہاں ٹھیک ٹھیک دن اور ماہ کی تعیین کے ساتھ تاریخ نہیں معلوم ہو سکی ہے، وہاں ہجری سن کے مقابلے میں دو عیسوی سن دئے گئے ہیں۔

۳۔ جہاں کہیں "شیخ الاسلام" اور "شیخ" کے لفظ بلا کسی نام کے آئے ہیں، وہاں مراد شیخ محمد بن عبدالوہابؒ ہیں۔ اسی طرح آل الشیخ سے اُن کی اولاد و احفاد مراد ہیں۔ گو اس جماعت کے لٹریچر میں شیخ الاسلام کا لقب عام طور پر امام ابنِ تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

۴۔ عربی اور انگریزی عبارتوں کے ترجمے اور اقتباس میں حرف بہ حرف لفظی ترجمہ کا التزام نہیں کیا گیا ہے، البتہ اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اصل کا مفہوم ترجمہ یا اقتباس میں ٹھیک ٹھیک ادا ہو جائے۔

۵۔ یورپی اعلام کے تلفظ میں غلطی کا امکان ہے۔ اگر کہیں ایسی چوک یا لغزش نظر آئے، تو راقم کو مطلع فرما دیا جائے۔ تصحیح کسی قسم کی بھی ہو، انتہائی شکریے کے ساتھ قبول کی جائے گی۔

پہلا باب

ذاتی حالات

جزیرۃ العرب مسلمانوں کے دورِ عروج میں

عرب کے ریگستانوں نے گو لیل و نہار کے ہزاروں تماشے دیکھے ہیں، مگر شاید اس تماشے سے بڑھ کر کوئی تماشا نہ ہوگا کہ تاریک ذرّوں نے ایک چمکتے سورج (وجودِ نبوی) کے پرتو سے روشن ہو کر ساری دنیا کی آنکھوں کو اپنی چمک دمک سے روشن کر دیا، اور خود ان کے گوشہ گوشہ کو مطلعِ انوار بنا دیا اور عین اس وقت جب وہ دشت و جبل اور بحر و بر کو منور کر چکے خود ایسے ماند پڑ گئے کہ دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، یہ کیوں؟ اس لئے کہ ان قوموں نے جو اس نور سے منوّر ہوئیں، یہ سمجھا کہ ان ریگستانی ذرّوں کی تابانی کے مقابلے میں ان کی چمک اور تابانی نگاہوں کو خیرہ نہ بنا سکیں گی، اس لئے ان کا تاریک اور ماند ہی رہنا اچھا ہے'۔

(سید سلیمان ندوی: معارف نومبر ۲۴ء)

یوں تو بنو اُمیّہ کے دورِ حکومت ہی میں حجاز کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی، دمشق کے شاطروں نے حرمین کو پیرزادوں کی خانقاہ بنا دیا۔ اور پھر ابو مسلم خراسانی کی تلوار نے عربوں کی سیاسی قسمت ہی کا فیصلہ کر دیا (۱۳۲ھ)۔ اور جو عباسی سلطنت اس کے بل بوتے پر قائم ہوئی، رفتہ رفتہ عجمی شہنشاہی بن گئی۔ معتصم (۲۱۸ھ/۸۳۳ء - ۲۲۷ھ/۸۴۲ء) کے دور میں ترکوں نے زور پکڑا، اور پھر تخت و تاج نے ان کے قدم لئے۔ نہ دیک اور دو درجن سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، پر غریب عرب کا اس تگ و تاز میں کوئی حصہ نہ تھا

مسلمانوں کے عروج کی ان صدیوں میں بغداد اور قرطبہ کی علمی درسگاہیں قائم ہوئیں، ازہر (مصر)، زیتونہ (تونس)، اور قرویین (فاس) کی مسجدوں سے علم و عمل کے چشمے جاری ہوئے۔ ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیا، سلیمان اعظم (۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء - ۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء) نے ویانا کی دیوار ہلا دی، مغلوں نے ہندوستان کو زیر و زبر کیا، لیکن عرب کا شتربان اپنے صحرا میں آرام کی نیند سوتا رہا۔ عثمانی ترکوں نے حجاز پر صدیوں حکمرانی کی، لاکھوں کروڑوں کے چڑھاوے دیئے۔ مصر کے خراج کا بیشتر حصہ حرمین کی خدمت کے لئے وقف رہا۔ مجاوروں اور متولیوں کے لئے بیش قرار وظیفے مقرر کئے۔ پر عرب کی وادی غیر ذی زرع میں کہیں علم کا چشمہ جاری نہ ہوا۔ فقیروں کی زبان ترکی رہی۔ اللہ اکبر! خلیفۃ المسلمین کی حکومت اور مہبطِ وحی میں غیر قرآنی زبان کا چلن! عبرت کا مقام ہے! اس ذلیل دنیا اور بادشاہی نے کیا کیا نہیں کرایا۔ ہاں! سرکاری زبان ترکی رہی، افسر ترکی رہے۔ رہے عرب، تو مزاروں کی مجاوری اور گداگری، یا پھر ایامِ جاہلیت کے نمونے پر لوٹ کھسوٹ اُن کا کام رہ گیا تھا۔

محمد بن عبدالوہابؒ بالآخر جب دنیا پھر تاریکی میں مبتلا ہوگئی، مسلمان کتاب وسنّت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے۔ ایک اللہ کی جگہ سینکڑوں معبود بنا لئے گئے۔ مصر میں بدوی رفاعی، عراق و ہند میں عبدالقادر جیلی، مکّہ و طائف میں ابن عباسؓ، یمن میں ابنِ علوان سے مرادیں مانگی جانے لگیں[1] اور مسلمان ہر شجر و حجر کے آگے جھکنے لگے۔ جب یہ حالت ہوگئی، تو پھر اسی بے آب وگیاہ سرزمین پر پہلے پہل تذکیر و ہدایت کا آفتاب ضوفگن ہوا، اور خاکِ عرب کے وہ ذرّے جو جہل و شرک کی طغیانی کے باعث ماند پڑ گئے تھے، پھر چمک اُٹھے۔ اور نجد کے چمنستان سے جو اپنے عرار و خزامی[2] کی عطر بیزی کے لئے مشہور ہے، توحید و کلمۂ حق کی دلکش خوشبو پھیلی، جس نے تمام عالم کو زعفران زار بنا کر چھوڑا۔ میری مراد شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب (رحمہ اللہ و نوّر ضریحہٗ) کی ذاتِ گرامی سے ہے، جنہوں نے اپنی مسلسل اور ان تھک کوششوں سے توحید کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، اور جہاں تک اس مردِ مجاہد کی آواز پہنچ سکتی تھی، اس نے حق و صداقت کا پیغام پہنچایا۔

ابن عبدالوہابؒ کی پیدائش کے وقت دنیائے اسلام کی حالت یوں تو اسلامی دنیا کا فکری زوال آٹھویں صدی ہجری کے اختتام پر اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا۔ اجتہاد و فکر کے دروازے عرصہ ہوا بند ہو چکے تھے۔ متاخرین کے متون و حواشی اور منہیات علماء کے زیرِ درس تھے۔ عملی حالت اس سے بھی زیادہ گری ہوئی تھی۔ لیکن بارھویں صدی ہجری

---

[1] تطہیر الاعتقاد عن ادران الالحاد لمحمد بن اسماعیل الامیر الصنعانی ص۱۰

[2] نجد کے عرار و خزامی کا ذکر کلامِ عرب میں بکثرت آتا ہے۔ محمود شکری آلوسی (ف ۱۳۴۲ھ) نے اپنی تاریخ نجد میں اس سلسلے کی منظومات بکثرت نقل کی ہیں۔ (ص ۱۹)

کے آغاز میں یہ انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ غیر مسلم بھی عہدِ صحابہ کے حالات سے اس دور کے مسلمانوں کا موازنہ کرتے، تو انہیں تعجب وافسوس ہوتا۔ امریکی اہل قلم اسٹاڈرڈ[1] کے بیان کے مطابق :-

"مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا۔ تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں جاہل عوام ان سے بھاگتے تھے اور تعویذ گنڈے اور مالا میں پھنس کر گندے فقیروں اور دیوانے درویشوں پر اعتقاد رکھتے، اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے، جن کی پرستش بارگاہِ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی تھی۔ کیونکہ ان جاہلوں کا خیال تھا کہ خدا کی برتری کے باعث وہ اس کی طاعت بلا واسطہ ادا نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم کی تعلیم نہ صرف پسِ پشت ڈال دی گئی تھی، بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی یہاں تک کہ مقاماتِ مقدسہ (مکہ و مدینہ) بداعمالیوں کا مرکز بن گئے تھے۔ اور حج جس کو رسول اللہ نے فرائض میں داخل کیا تھا بدعات کی وجہ سے حقیر ہو گیا تھا۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر دنیا میں آتے، تو وہ اپنے پیروؤں کے ارتداد اور بت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے۔"

ایک غیر مسلم مبصر کے اس تیار کردہ خاکے میں مسلمانوں کے جو خط و خال نظر آتے ہیں وہ آج بھی بڑی حد تک صحیح ہیں یا نہیں، امیر شکیب ارسلان (ف ۱۹۴۶ء) کی رائے میں پہلے سے بڑا اور دقیق النظر عالم بھی بارھویں صدی کے مسلمانوں کی اس سے زیادہ صحیح اور واضح

---

[1] The New World of Islam. ص ۲۶ - ۲۵-

تصویر نہیں کھینچ سکتا تھا۔[1]

طولِ کلام اگر بار نہ ہو، تو اپنی بدنصیبی کی مزید داستان ایک دوسرے مغربی مُبصر کی زبانی بھی سن لیجیے:-

"اٹھارہویں صدی میں مسلمانوں کا جوش سرد تھا، نام نہاد خلیفہ کی ساکھ گر چکی تھی اور مقبوضہ کے جنوب میں اطاعت تسلیم بھی نہیں کی جاتی تھی۔ یمن ایک صدی پہلے یہ جُوا اپنی گردن سے اُتار چکا تھا۔ مکہ کے اشراف عیسائیوں کی نسبت اپنے سردار کی مخالفت میں زیادہ سرگرمی دکھانے کو تیار تھے۔ یہ یکجہتی جو آج دکھائی دیتی ہے، اُس وقت اس کا احساس بہت کم تھا، اور روحانی مرکز مکہ مادی عیش و آرام کا شکار ہو چکا تھا۔ اور تقویٰ و زہد کے علاوہ وہاں ہر چیز کے لئے رواداری موجود تھی۔ حالاں کہ ہندوستان میں عیسائیوں کی فتح نگاہوں کے سامنے تھی، اور یورپ میں بھی غیر مُسلم طاقتیں ترکوں کا پانسہ پلٹ رہی تھیں، لیکن عرب میں ان واقعات کا بہت کم احساس تھا، اور یہ عام غیظ و غضب جس کا مظاہرہ آج[2] فرانس، برطانیہ اور روس کے خلاف کیا جا رہا ہے۔ اس وقت بالکل مفقود تھا۔ جہاں غصہ نہیں وہاں، جوش نہیں، چہ جائیکہ تبلیغی کوششیں ہوں۔ (خلاصہ یہ کہ) اس وقت اسلام کا رُخ تنزل کی طرف تھا، اور یہ تجدد جس کی لہر انیسویں صدی عیسوی میں افریقہ اور چین تک پہنچ کر رہی، اس وقت اس کی پیش بینی نہیں کی جا سکتی تھی۔"[3]

---

۱ حاضر العالم الاسلامی جلد ۱ صفحہ ۲۶۰-۲۵۹ ؛ ۲ سنہ ۱۹۰۴ء میں یہ کتاب تالیف ہوئی۔

۳ Hogarth : Penetration of Arabia

نجد ابن عبدالوہاب سے پہلے | بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں اسلامی دنیا اور مقامات مقدسہ کا جو حال تھا، اس کا ہلکا سا اندازہ اوپر کے بیانات سے ہوا ہو گا۔ لیکن جزیرۃ العرب کے قلب (نجد) کی حالت اور بھی خراب تھی۔ کم سے کم جو کہا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ اہل نجد اخلاقی انحطاط میں حد سے گزر چکے تھے، اور ان کی سوسائٹی میں بھلائی برائی کا کوئی معیار نہیں قائم رہا تھا۔ مشرکانہ عقیدے صدیوں کے تسلسل سے اس طرح دلوں میں گھر کر چکے تھے، کہ ایک بڑا طبقہ ان ہی خرافات کو دین صحیح کا نمونہ جانتا تھا، اور غلط یا صحیح وہ اپنے آباء و اجداد کی روش سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

جبیلہ (وادی حنیفہ) میں زید بن خطاب کی قبر کی پرستش ہوتی تھی۔ درعیہ میں بھی بعض صحابہ کے نام سے منسوب قبریں اور قبے عوام کی جاہلانہ عقیدت کے مرکز بنے ہوئے تھے۔

وادی غبیرہ میں ضرار بن ازور کا قبہ بدعتوں کی نمائش گاہ بن رہا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بلیدۃ الفدا میں ایک پرانے درخت کے ساتھ جوان مرد اور عورتیں جو سلوک کرتی تھیں، ان کے بیان سے زبانِ قلم قاصر ہے۔ خلاصہ یہ کہ مایوس عورتیں اولاد کی تمنا میں اس درخت سے ہمکنار ہوتی تھیں۔ نیز درعیہ کے پاس ایک غار تھا، جہاں حد درجہ شرمناک برائیاں ہوتی تھیں[1]۔ الخ

---

[1] نجد کی بدعات کا ذکر تمام تاریخوں میں آتا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔

(الف) روضۃ الافکار والافہام۔ لمرتاد حال الامام وتعداد غزوات ذوی الاسلام تالیف شیخ حسین بن غنام (ف ۱۲۲۵ھ) (ص ۱۶-۱۷)۔

(ب) عنوان المجد فی تاریخ نجد ص ۶ تالیف عثمان بن بشر النجدی (ف ۱۲۸۸ھ) (یہ دو کتابیں تاریخ نجد پر اُمّ اور اصل کا حکم رکھتی ہیں)۔

(ج) الہدیۃ السنیۃ والتحفۃ الوہابیۃ النجدیۃ، مرتبہ سلیمان بن سحمان (ص ۷-۹) نیز تبرئۃ الشیخین الامامین مؤلفہ سلیمان بن سحمان (ص ۱۶۱-۱۶۳)

یہ سب کچھ دین اور مذہب کے نام پر ہوتا تھا، اور جو دو چار اشخاص فقہ و حدیث سے بہرہ ور تھے، وہ اپنے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہمت نہیں پاتے تھے۔ آخر علمائے نجد دنیا کے علماء سے الگ تو تھے نہیں!!

سیاسی حالت اور خراب تھی۔ خانہ جنگی اور بدحالی عام تھی۔ شمالی نجد (جبل شمر) قبیلہ طے اور حسا میں بنو خالد کا زور تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عُیینہ کی امارت حسا کے بنو خالد کا اقتدار مانتی تھی۔ درعیہ میں قبیلہ محمد بن سعود بن مقرن کے قدم جم رہے تھے۔ درعیہ سے قریب ریاض میں وہ اس کی الگ امارت قائم ہو گئی تھی۔ نجد کا چھوٹا سا علاقہ[1] چھوٹی چھوٹی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) (د) فلبی کی Arabia (دی ماڈرن ورلڈ سیریز) ص ۵-۴، فلبی اور ابنِ بشر دونوں کا ماخذ بھی ابن غنام ہی کی کتاب ہے۔

[1] فلبی: ص ۷-۶ عرب کے مختلف حصوں اور خاص کر نجد کا جغرافیہ ذرا مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ ہمارے ہاں جیسی صوبہ اور ضلع وار مرتب تقسیم ان کے ہاں نہیں ہے۔ اور نہ موجودہ دور سے پہلے ملک میں کوئی قابل ذکر سیاسی وحدت تھی۔ مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ نجد کے تین بڑے بڑے حصے ہیں:

(ا) شمال مغربی حصہ جس کا نام شمر ہے، اس کے مشہور شہر حائل اور القصر ہیں۔

(ب) شمالی مشرقی حصہ جس کا نام القصیم ہے، اس کے مشہور مقامات عنیزہ اور بریدہ ہیں۔

(ج) جنوبی حصہ جو العارض کہلاتا ہے، جس کا مشہور شہر ریاض ہے، جو آج سعودی حکومت کا پایہ تخت ہے۔ عارض کو جبل یمامہ بھی کہتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک پہاڑی کا نام ہے، اور اس کے گرد و نواح کی زمین وادی حنیفہ اور یمامہ کہلاتی ہے۔ شیخ الاسلام کی جائے پیدائش عُیینہ اور دعوت کا مرکز

ریاستوں میں بٹا ہوا تھا[1]

خاندان اس پُر آشوب دور اور ناموافق ماحول میں محمد بن عبدالوہاب نے آنکھیں کھولیں۔ عُیینہ[2] کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے[3] (۱۱۱۵ھ؍۱۷۰۳ء) ان کے جدامجد سلیمان[4] بن علی بن

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳، دُرعیہ دونوں، اسی وادی میں واقع ہیں، جو نجد کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: لفظ Arabia جلد ۱ صفحہ ۳۷۱ اور (Najd) جلد ۳ صفحہ ۹۳-۹۶ء

[1] مشہور شاعر و ادیب خالد بن محمد الفرج نے رسالہ "الحج"، مکہ مکرمہ [جلد ۵ عدد ۴] میں نجد کی تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی تفصیل دی ہے۔ یہاں اس کے درج کرنے کی خاص ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

[2] عُیینہ (بضم عین)، عین (چشمہ کے معنی میں)، کی تصغیر ہے۔ اور اب اسے "بلد الشیخ" بھی کہتے ہیں۔

[3] ابن غنام: ج ۱ ص ۳۰؛ عنوان المجد جلد ۱ صفحہ ۱۳۰۔ بعد کے لکھنے والوں میں احمد بن زینی دحلان (الدرر السنیۃ صفحہ ۴۲؛ خلاصۃ الکلام صفحہ ۲۲۹) نے ۱۱۱۱ھ اور امیر شکیب (حاضر جلد ۴ صفحہ ۱۶۱) نے ۱۱۱۶ھ تاریخ ولادت بتلائی ہے، جو غلط ہے۔ اسی طرح Hughes (ڈکشنری آف اسلام صفحہ ۶۵۹)، ولفرڈ بلنٹ (اسے بلگریو ٹو نجد (ضمیمہ) صفحہ ۲۵) زویمر Arabia : The Cradle of Islam وغیرہم نے تاریخ ولادت ۱۶۹۱ء لکھی ہے، جو یکسر غلط ہے۔ ہوگارتھ صفحہ ۳ نے بھی سالِ ولادت غلط (۱۶۹۶ء) دیا ہے اور انہیں ماخذوں کی پیروی میں اپنے بھی ٹھوکر کھاتے ہیں۔

[4] (ا) شیخ کا پورا نسب نامہ یہ ہے:۔

محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان بن علی بن محمد بن احمد بن راشد بن برید بن مشرف الخ

(ب) السحب الوابلۃ علی ضرائح الحنابلۃ (مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ پٹنہ) میں اس خاندان کے مندرجہ ذیل افراد کے حالات ملتے ہیں:

۱۔ سلیمان بن علی بن مشرف (صفحہ ۱۴۳)۔

مشرف[1] (ف ۱۰۷۹ھ) اپنے زمانہ کے مشہور عالم اور علمائے نجد کے مرجع وماوی تھے۔ مناسک میں ان کی کتاب مشہور رہی ہے۔ اور السحب الوابلہ کے بیان کے مطابق مناسک کے باب میں عام طور پر حنابلہ اسی پر اعتماد کرتے ہیں، (ص ۱۰۳) ان کے چچا ابراہیم بن سلیمان بھی ممتاز عالم تھے۔ ابراہیم کے بیٹے عبدالرحمٰن (ف ۱۲۰۶ھ) بھی فقیہ وادیب تھے۔ شیخ کے والد عبدالوہاب ابن سلیمان (ف ۱۱۵۳ھ) بھی فقہ میں دخل رکھتے تھے، اور ایک عرصہ تک عُیَینہ اور حریملا میں عہدہ قضا پر مامور رہے۔ سلیمان بن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۸ھ) اور ان کے فرزند عبدالعزیز (ف ۱۲۶۳ھ) بھی ممتاز علمی حیثیت کے مالک تھے۔ ۱۲۳۶ھ میں مصری غارتگری کے وقت وہ حریملا میں موجود تھے، محبوس کئے گئے اور طرح طرح کی سختیوں سے دوچار ہوئے۔ ان کا کتاب خانہ نذرِ آتش کیا گیا، اور مال واسباب لوٹ لیا گیا۔ (عنوان جلد ۱ ص ۲۳۹)

نشوونما محمد بن عبدالوہاب آغازِ طفولیت ہی سے ذہانت اور قوتِ حافظہ میں ممتاز تھے۔ دس برس کی عمر سے پہلے قرآنِ مجید کے حفظ سے فارغ ہوگئے۔ اپنے والد سے فقہ حنبلی کی کتابیں پڑھیں اور بچپن ہی میں حدیث وتفسیر کی کتابیں کثرت سے مطالعہ کیں۔ ان کے والد عبدالوہاب ہونہار لڑکے کی ذہانت اور استعداد سے متعجب ہوتے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴) ۲۔ ابراہیم بن سلیمان بن علی (ص ۹)

۳۔ عبدالوہاب بن سلیمان بن علی، سلیمان بن عبدالوہاب، عبدالعزیز بن سلیمان (ف ۱۲۶۳ھ) ص ۲-۱۷۱۔

۴۔ عبدالوہاب بن عبداللہ بن عبدالوہاب بن مشرف (ف ۱۱۲۵ھ) ص ۱۷۲۔

[1] محمد بن عبدالوہاب سے پہلے ان کا خاندان آلِ مشرف کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اب آلِ الشیخ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

ان کا بیان ہے کہ محمد کی تدریس کے دوران میں وہ خود بھی اپنے ہونہار بچے کی ذہانت اور وسعت معلومات سے مستفید ہوئے۔ شیخ عبدالوہاب اپنے بیٹے کے علم سے اس قدر متاثر تھے، کہ نو عمری کے باوجود انہیں امامت کے لئے آگے بڑھاتے۔ کم سنی ہی میں شادی ہوئی، اور فریضۂ حج سے مشرف ہوئے۔ مدینہ منورہ میں دو ماہ قیام کے بعد عُیینہ واپس ہوئے۔ اور اپنے والد ماجد سے تحصیلِ علم میں مصروف ہو گئے۔ یادداشتیں اور علمی کتابیں نقل کرنے میں اتنی محویت ہوتی کہ ایک ایک نشست میں بیس بیس صفحے لکھ جاتے۔[1]

علم کی راہ میں ابنِ عبدالوہابؒ قدرت کی طرف سے غیر معمولی حساس دل لے کر آئے تھے اردگرد و نجد کے شہروں اور بستیوں کی حالت دیکھ دیکھ کر کبیدہ خاطر ہوتے۔ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا، خود اہلِ علم کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ محمد اپنے والد عبدالوہاب سے، جو نجد کے علماء میں ممتاز تھے، جو کچھ حاصل کر سکتے تھے، اس میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ لیکن ہونے والے مصلح اور مجدد کی پیاس دو چلو پانی سے کس طرح بجھ سکتی تھی؟ حج سے مشرف ہو چکے تھے، حجاز کی مرکزیت دل میں گھر کر چکی تھی، طلبِ علم کا خیال آتے ہی حجاز کا ارادہ ہُوا۔ یہ پُرجوش نوجوان کی عمر کوئی بیس برس کی ہو گی، کہ لیلائے علم کے شوق میں اُس نے دشت نوردی کی ٹھانی اور حجاز کا رُخ کیا۔[2]

دوبارہ حج بیت اللہ اور مسجد نبوی کی زیارت سے مشرف ہو کر علماء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تحصیلِ علم میں منہمک ہو گئے۔ خاص طور پر نجد کے مقام مجمعہ کے

---

[1] ابن غنام ص ۳۰ ۔ [2] یہ تقریباً ۱۱۳۵ھ کا واقعہ ہے۔

ایک مشہور عالم عبداللہ ابنِ ابراہیم بن سیف (جو جوارِ رسول ؐ میں جا کر بس گئے تھے)[1] کی صحبت سے مستفیض ہوئے۔

شیخ عبداللہ بن ابراہیم نجدی (مدنی) کی جلالتِ قدر اور اخلاص کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے جو خود شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی زبانی منقول ہے۔ شیخ کہتے ہیں:

"میں ایک دن ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا، کہ انھوں (عبداللہ بن ابراہیم) نے فرمایا "تمھیں وہ ہتھیار دکھاؤں جو میں نے اہلِ مجمعہ کے لئے تیار کیا ہے؟" میں نے کہا "ضرور"۔ تو مجھے وہ ایک کمرے میں لے گئے، جہاں کتابوں کا انبار تھا، اور بولے "ہم نے ان لوگوں کے لئے یہی ہتھیار فراہم کئے ہیں"۔ (عنوان ص۶)

شیخ عبداللہ بن ابراہیم ہی کے توسط سے شیخ محمد حیات سندھی[2] (ف ۱۱۶۵ھ) سے تعارف حاصل ہوا، جو اس وقت مدینۃ الرسول میں حدیث و سنت کے مسلم استاذ تھے۔ ابن عبدالوہابؒ ان کے مخصوص شاگردوں کے حلقہ میں داخل ہو گئے اور عرصہ تک خدمت میں حاضر رہے۔ اسی سلسلہ میں شام کے نامور عالم شیخ علی داغستانی (ف ۱۱۹۹ھ)[3] سے بھی ابن عبدالوہاب کی شاگردی کا ذکر کیا جاتا ہے، جو قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

اسی طرح مدینہ منورہ کے مشہور محدث محمد بن سلیمان کردی مدنی (ف ۱۱۹۴ھ) سے بھی

---

[1] عبداللہ بن ابراہیم بن سیف اپنے وقت کے مشہور فقیہ تھے۔ شام جا کر مشہور حنبلی عالم شیخ ابوالمواہب حنبلی (ف ۱۱۲۶ھ) سے استفادہ کیا۔ ان کے بیٹے ابراہیم بن عبداللہ بن ابراہیم (ف ۱۱۸۹ھ) بھی مشہور عالم تھے۔ ان کی کتاب العذب الفائض فی شرح الفیۃ الفرائض مشہور ہے (السحب الوابلۃ ص ۱۲-۱۱)۔

[2] عنوان المجد ۱: ۲۵، سلک الدرر: ۴، ۳۴)۔ [3] شیخ علی داغستانی اپنے

استفادہ کا ذکر بعض تاریخوں میں آتا ہے، لیکن مستند اور معاصر تاریخوں کی خاموشی کے علاوہ سنین اور واقعات بھی اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں[1]۔

استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ (سلاطینِ نجد کا مذہب، معارف، نومبر ۲۴ء) نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (ف ۱۱۷۶ھ) اور شیخ الاسلامؒ دونوں کا منبعِ فیض ایک (مسجد نبوی) بتایا ہے۔ اصلی سرچشمہ (کتاب وسنت) کے اتحاد کے ساتھ ساتھ درس گاہ (مسجد نبوی) کے ایک ہونے میں بھی شبہ نہیں، لیکن استاد کی شرکت کا پتہ نہیں چلتا۔

لیب بتنونی (الرحلۃ الحجازیۃ، صفحہ ۸۷) نے مکہ مکرمہ میں تحصیل علم کا ذکر کیا ہے، لیکن کسی مستند روایت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷) عہد کے علمائے دمشق میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں ایک عرصہ تک قیام پذیر رہے۔ شیخ محمد حیات سندھی سے روایتِ حدیث کی۔ اور بیشتر اُن سے مستفید ہوئے۔ ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے، مدینہ منورہ تحصیل علم کو آئے اور ایک مدت وہاں قیام پذیر رہے۔ ۱۱۵۰ھ میں لوٹ گئے (سلک الدرر جلد ۳ ص ۲۱۵) شیخ کے زمانۂ قیام مدینہ منورہ میں ان کی عمر بہت کم رہی ہوگی، اس لئے اُن سے شیخ کا مستفید ہونا قرین قیاس نہیں۔ معاصرین میں محب الدین خطیب (الزہراء رجب ۴۵ھ) اور محمد حامد فقی (اثر الدعوۃ الوہابیۃ فی الاصلاح الدینی ص ۲۷) نے اس کا ذکر کیا ہے۔

[1] ابنِ غنام اور ابنِ بشر نے محمد بن سلیمان کردی کی شاگردی کا ذکر نہیں کیا۔ صرف احمد زینی دحلان (الدرر السنیۃ: ۴۲، ۴۵) نے شیخ کردی کی شاگردی کا ذکر کیا ہے اور بڑے زور و شور سے۔ دحلان کی اس کتاب اور خلاصۃ الکلام فی امراء البلد الحرام میں اس درجہ غلط بیانیاں بلکہ افترا پردازیاں ہیں کہ اس غیر معتبر روایت پر بھی یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مزید یہ کہ سنین کی شہادت

مدینہ منورہ سے شیخ نے بصرہ کا قصد کیا۔ اور وہاں شیخ محمد مجموعی سے حدیث و لغت کا درس لیا، اور ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے رہے۔ ابنِ بشر نے اپنے استاذ عثمان بن منصور ناصری سے روایت کی ہے، کہ شیخ محمد مجموعی کی اولاد بھی علم و عمل میں ممتاز حیثیت رکھتی تھی[۱]۔ شام[۲] کا بھی ارادہ رکھتے تھے، لیکن زادِ راہ کی کمی کے باعث کامیاب نہ ہوئے۔ اور احسا ہو کر حریملا (نجد) لوٹ آئے، جہاں اُن کے والد ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں عُیینہ سے منتقل ہو چکے تھے۔

دعوت و تبلیغ ابنِ عبدالوہاب بچپن ہی سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف مائل تھے۔ ابھی وہ عُیینہ میں فقہ و حدیث کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے، کہ بدعات

(بقیہ حاشیہ صہ ۲۸) بالکل خلاف ہے۔ محمد بن سلیمان کردی سنہ ۱۱۹۴ھ میں سرسٹھ سال کی عمر پا کر فوت ہوئے (سلک الدرر، جلد ۴ صہ ۱۱۱-۳) تو گویا ان کی ولادت سنہ ۱۱۲۷ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔ اس طرح شیخ کے زمانہ تحصیل میں یہ بھی بالکل تو عمر ہوں گے اور ان سے شیخ کا مستفید ہونا بالکل قرینِ قیاس نہیں۔

[۱] عنوان المجد: صہ ۶۔

[۲] مارگولیوتھ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: ۴، ۵، ۶ - ۱۰۸۶) نے تو افترا پردازیوں کی انتہا کر دی ہے، وہ کہتا ہے:۔

"بغداد میں شادی کی، بیوہ دو ہزار دینار چھوڑ کر مری"۔۔۔۔۔۔ کردستان ہمدان قم اصفہان کی زیارت کی اور قیام کیا"۔

اس کے علاوہ A Brief History of Wahhaby نے Brydges (صہ ۷) ہیں اور Hughes (صہ ۶۵۹)، نوبیر (صفحہ ۱۹۲)، پالگریو (صفحہ ۴ - ۳۶۲) ہیں سے کسی نے سفر بغداد، کسی نے سفر دمشق اور کسی نے دونوں کا ذکر کیا ہے، لیکن واقعہ یہی ہے۔ کہ شیخ الاسلام کو بصرہ

بقیہ صفحہ ۳۰ پر

ان کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے، اور جہاں کوئی عمل اصولِ دین کے خلاف پاتے، فوراً نہی عن المنکر کے فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتے۔

مدینہ منورہ میں محمد حیات سندھی اور علی بن ابراہیم بن سیف نجدی سے استفادہ کے بعد حدیث پر نظر ہوئی اور پھر چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا، تو انہیں دنیا گمراہی کی سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی نظر آئی۔ جہاں تک پتہ چلتا ہے، شیخ نے سب سے پہلے اسی زمانہ میں "استغاثہ" کے خلاف آواز بلند کی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ اطہر کے پاس جاہلوں کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ ایک مرتبہ وہ حجرۂ نبوی کے پاس کھڑے تھے۔ اور سامنے بدعات کا بازار گرم تھا۔ اتنے میں اُن کے استاذ محمد حیات سندھی آ گئے۔ شیخ نے پوچھا "ان لوگوں کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟" استاد نے جواب دیا: اِنَّ هٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ[1]۔

بصرہ میں یہ جذبہ اور تیز ہو گیا۔ نہی عن المنکر بلا خوف کرتے، جس کی پاداش میں انہیں طرح طرح کی تکلیفیں جھیلنا پڑیں۔ اور آخر بصرہ چھوڑنا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ ان سے تعلق اور ہمدردی کے جرم میں شیخ محمد مجموعی کو بھی ستایا گیا۔ بدبختوں نے انہیں ٹھیک دوپہر کے وقت نکالا۔ بیچارے اسی حال میں زبیر[2] کی طرف جا رہے تھے کہ راستے ہی میں پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ آخر ایک باخدا انسان ابو حمیدان نامی نے (جو کہ ایک گدھے رکھتا تھا) دست گیری کی اور پیاس بجھائی، نیز اپنے گدھے پر سوار کر کے زبیر پہنچا دیا[3]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹ سے آگے جانے کا موقع نہ ملا؛ بغداد، شام یا مصر کے سفر کا کوئی ثبوت نہیں۔

[1] عنوان المجد صفحہ ۶۔ [2] زبیر بصرہ سے قریب ایک قصبہ ہے، جو حضرت زبیر بن عوامؓ کے نام پر آباد ہے۔ اُس کے باشندے اس وقت بھی اتباعِ سنت میں ممتاز ہیں۔

[3] عنوان المجد صفحہ ۶۔

یہ سب دعوت کی ابتدائی منزلیں تھیں اور تمہیدی کام تھے۔ حریملا واپسی کے بعد انہوں نے بدعات کے استیصال اور توحید و اخلاق کے عام کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ دعوت کی بنیاد توحید کی پاکیزگی پر رکھی۔ اور عبادت کسی قسم کی ہو، صرف اللہ تعالٰی کی ذات کے ساتھ مخصوص کرنے پر زور دیا۔ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا بول بالا، ان کا شعار تھا۔ صدیوں کے بگڑے ہوئے اخلاق کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ وہ بدوؤں سے چوری، رہ زنی، مکاری، لوٹ مار کی بُری عادتیں چھڑا کر ان میں راست بازی اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جاہلوں کے غلط عقیدوں کی اصلاح معبودان باطل، قبہ و قبر سے ہٹا کر پھر معبود حقیقی کی درگاہ میں لاکھڑا کرنا ان کا مقصود تھا۔ پر یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے لئے ایمان خالص اور سچی عزیمت کی ضرورت تھی۔ اس راہ میں شیخ کو جن صبر آزما مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا اور جس خندہ پیشانی کے ساتھ انہوں نے اس راہ کی تکلیفوں کا استقبال کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان اوصاف سے پوری طرح متصف تھے۔

توحید کی دعوت دی۔ غیر اللہ کے آگے سر خم کرنے، قبروں اور ولیوں سے مدد مانگنے، نیکو کار بندوں کو معبود بنانے سے روکنے کی کوشش کی۔ قبروں کی زیارت میں مسنون طریقہ کے خلاف جو بدعتیں رائج ہو گئی تھیں، ان کے مٹانے کو عملی قدم اُٹھایا۔ بس پھر کیا تھا، مخالفت کا سیلاب امنڈ آیا۔ اعزہ و اقربا درپے آزار ہو گئے۔ خود باپ کو بھی یہ ادا پسند نہ آئی۔ شیخ نے باپ کے ادب اور استاذ کی عزت کا پورا لحاظ رکھا، پر جو قدم آگے بڑھ چکا تھا، وہ پیچھے نہ ہٹا۔ ایذا رسانی حد سے بڑھ گئی، پر صبر و عزیمت بلکہ کوہ وقار

اپنی جگہ سے نہ ٹل سکا۔ تمام رکاوٹوں کے باوجود انہوں نے اپنی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا، اور عارض کے تمام قصبات حریملاء، عُیَیْنَہ، درعیہ، ریاض وغیرہ میں ان کی شہرت پھیل گئی۔ اور تعلیمات کی اشاعت ہونے لگی۔

تبلیغ کا سلسلہ جاری تھا، لیکن والدِ ماجد کی سرد مہری[1] کے باعث رفتار سست تھی۔ ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں والد کا انتقال ہُوا، تو پھر دعوت و تبلیغ میں گرمی پیدا ہو گئی۔ علی الاعلان اتباعِ سنت اور ترکِ بدعات کا وعظ کرنے لگے۔ حریملا کے کچھ لوگ متاثر ہوئے۔ اور تحریک کے پُرجوش معاون بن گئے۔ شیخ کے درس میں حاضر ہونے لگے۔ اور ان کے مواعظ سے مستفید ہوئے۔ شیخ کی مشہور تالیف "کتاب التوحید" اسی دوران میں تالیف ہوئی[2]۔

عُیَیْنَہ میں ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء دعوت و تبلیغ کی ابتدائی منزلیں طے کرنے پر شیخ کو احساس ہُوا کہ اس افراتفری میں، کہ ہر ناحیہ[3] کا حاکم الگ ہے، کامیابی دشوار ہے۔ خود حریملاء

---

[1] محمد حامد فقی (صفحہ ۵۱) نے شیخ عبدالوہاب کو غیر جانبدار بتایا ہے۔ خالد بن محمد الفرج سال وفات ۱۱۵۲ھ لکھا ہے۔

[2] روضۃ الافکار، ص ۳۶۔

[3] عثمانی حکومت کے دور میں انتظامی آسانی کے خیال سے ملک کی تقسیم ان چار حصوں میں کی جاتی تھی۔
ولایۃ (صوبہ) لواء (کمشنری) قضاء (ضلع) ناحیۃ (تحصیل)، (سب ڈویژن)
عارض کا شمار ناحیہ میں تھا۔ آلوسی نے "ناحیۃ العارض" لکھا ہے۔ (صوبہ اور ضلع کی اصطلاحیں ہم نے مقابلہ کے لئے دی ہیں۔)

میں دو خاندان (قبیلہ) سرداری کے لئے دست و گریباں تھے[1]

ان حالات میں کوئی موثر قدم اٹھانا مشکل تھا۔ انہوں نے پورے نجد کو ایک امیر اور ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ سمجھتے تھے، کہ کسی امیر (حاکم صاحب نفوذ و قوت) کی ہمدردی حاصل کئے بغیر دعوت کو دور و نزدیک جلد از جلد پھیلانا آسان نہیں۔ ان خیالات کے پیش نظر انہوں نے عثمان بن معمر امیر عُیَینہ سے خط و کتابت کی۔ اور امیر کو قبولِ حق پر آمادہ پا کر خود بھی عُیَینہ منتقل ہو گئے، امیر نے اچھی طرح آؤ بھگت کی اور شیخ کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ جوہرہ بنت عبد اللہ بن معمر سے شیخ کی شادی ہوئی، جس سے ظاہری طور پر تعلقات زیادہ مستحکم ہو گئے۔ شیخ کے سامنے ایک متعین مقصد تھا۔ ذاتی اور خاندانی تعلقات حصولِ مقصد کا ذریعہ ہو سکتے تھے، خود مقصد نہیں تھے۔ انہوں نے امیر عُیَینہ کے سامنے دعوت پیش کی، توحید کا مفہوم واضح کیا اور اس جلیل القدر مہم میں امداد و تعاون کی درخواست کی۔ شیخ کے یہ الفاظ یادگار اور قابلِ نقل ہیں[2]

انی ارجو ان انت قمت	اگر تم لا الٰہ الا اللہ کی امداد کو آمادہ
بنصر لا الٰہ الا اللہ ان	ہو جاؤ، تو میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ
یظہرک اللہ تعالیٰ	تمہیں غالب کرے گا اور نجد اور اہل نجد

---

[1] عنوان المجد (ص ٦) میں بعض غلاموں کی شرارت کا ذکر ہے جو، شیخ کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے۔ دوسری کتابوں میں جہاں کہیں بھی اس کا ذکر ہے، غالباً ماخذ یہی ہے۔

[2] عنوان ص ٩۔

وتملك نجداً و اعرابها   کی باگ تمہارے ہاتھوں میں ہوگی۔

عثمان کو یہ پیش کش صدق دل سے کی گئی تھی، پر افسوس کہ وہ اس پر قائم نہ رہا، جس کا خمیازہ اُسے بھگتنا پڑا۔ اور آخر کار یہ نعمت عُیَینہ سے درعیہ منتقل ہو گئی۔ بہرحال عثمان بن حمد بن معمر نے امداد کا وعدہ کیا، اور اس کی معاونت کے سہارے شیخ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کھلم کھلا دعوت دینا شروع کی، اور رفتہ رفتہ اہلِ عُیَینہ کے دل قبول حق کی طرف مائل ہونے لگے۔

شیخ نے اس اثنا میں، بدعات کے بعض اڈوں کے ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا، جس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس علاقہ میں بعض درختوں کی توقیر کی جاتی تھی۔ انھیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ زید بن خطابؓ (جو یوم یمامہ میں شہید ہوئے تھے) کے نام سے مقام جبیلہ میں ایک قبر تھی، اور اس پر قبہ، اس کا بھی خاتمہ کیا، جو اس وقت کے لحاظ سے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ابنِ بشر اس قبّہ کے انہدام کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے:

> شیخ نے عثمان سے کہا: "آؤ اب اس قبہ کو منہدم کر دیں، جس کی بنیاد باطل پر رکھی گئی ہے اور جس کی وجہ سے لوگ راہِ ہدایت سے بھٹک گئے ہیں۔" عثمان نے کہا: "آپ ہی اسے ہدم کر دیں۔" شیخ نے فرمایا کہ "ہمیں اہلِ جبیلہ سے خطرہ ہے۔ کہیں وہ ہمارے درپے آزار نہ ہو جائیں۔ آپ کی موجودگی کے بغیر میں ہدم نہیں کر سکتا۔" اس پر عثمان چھ سو آدمیوں کے ساتھ چلا، قریب پہنچنے پر اہل جبیلہ نے بزور روکنے کا ارادہ کیا، لیکن جب انھوں نے عثمان کی طرف سے بھی پوری تیاری دیکھی، تو

ہٹ گئے۔ اس پر عثمان نے شیخ سے کہا کہ "ہم قبہ کو چھو نہیں سکتے" ۔ اس پر شیخ نے ہتھوڑا (تاس) لیا اور اپنے ہاتھ سے قبہ کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا، اور کامیاب واپسی ہوئی۔ اس رات کو اطراف و نواح کے جاہل بے چینی کے ساتھ انتعار کر رہے تھے، کہ دیکھیں اس "ناروا اقدام" سے شیخ پر کیا آفت آتی ہے۔ لیکن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے، جب صبح ہوئی تو لوگ بہت مایوس ہوئے اور اہلِ حق کی ہمت بندھی نیز کمزوروں کے ایمان میں تازگی آئی"[1]

یہ صرف ایک واقعہ کی تفصیل تھی۔ وہاں قدم قدم پر یہی دشواریاں تھیں۔ جاہلوں سے لے کر علماء اور مشائخ تک سب کے سب بدعات کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ یہ ابنِ عبدالوہاب کی آواز اور کوشش تھی، جس نے صدیوں کی تاریکی اور گمراہی کے بعد حق کا بول بالا کیا اور صحیح اسلامی تعلیم سے خلقِ خدا روشناس ہوئی۔

شیخ نے امیر عثمان بن معمر کو نماز باجماعت کے اجرا کی بھی تاکید کی اور سستی کرنے والوں کے لئے سزائیں تجویز ہوئیں حکام طرح طرح کے ٹیکس وصول کرتے تھے، شیخ نے تمام ٹیکس اڑا دئے اور صرف زکوٰۃ کا اجرا کیا۔ شیخ نے قیام عیینہ کے دوران میں ابنِ معمر کے ہاتھ سے یہ دو کام اچھے کرائے، لیکن ان کے دشمن اس میں بھی حرف نکالتے تھے۔

شیخ نے عیینہ ہی میں اپنے تبلیغی رسالوں کا سلسلہ شروع کیا، جو مرتے وقت تک جاری رہا۔ درعیہ میں ان کے ماننے والے کچھ پیدا ہو گئے تھے، ان ہی کے نام آپ نے عیینہ سے ہدایت نامے جاری کئے تھے[2]

---

[1] عنوان المجد: ص ۱۰-۹ [2] روضۃ الافکار، ج ص ۲۰۰

عُیَینہ سے اخراج عیینہ میں کامیابی قدم لینے کو تھی اور اصلاح کی مہم مکمل ہوتی جا رہی تھی کہ قدرت نے ایک شر پیدا کیا جس میں ہزاروں برکتیں پنہاں تھیں۔

"ہونے والی بات، ایک شادی شدہ عورت گناہ کی مرتکب ہوئی اور اُس نے شیخ کے سامنے گناہ کا اعتراف بھی کر لیا۔ بار بار جرح کرنے پر بھی وہ اپنے اقرار سے نہ پھری تو مجبوراً شیخ نے سنگ ساری کا حکم دیا۔ عثمان بن معمر نے مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ یہ فرض انجام دیا۔ سب سے پہلا شخص جس کا ہاتھ پتھر کی طرف بڑھا، وہ عثمان تھا۔"[1]

اس غیر متوقع حادثہ نے اطراف و جوانب میں تہلکہ پیدا کر دیا خصوصیت کے ساتھ اُن حلقوں میں جو برائیوں کے خوگر تھے اور زیادہ کھلبلی مچی۔ بات لگانے والے سلیمان بن محمد عزیز الحمیدی (حاکم احساء و قطیف) کے دربار میں پہنچے، اور اسے شیخ کی مخالفت پر آمادہ کیا۔ یہ شخص نہایت رنگیلا اور آوارہ مزاج تھا۔ رجم کے واقعہ سے اس کا برہم ہونا بالکل متوقع تھا، کہنے والوں نے اس سے کہا کہ یہ شخص ابن عبدالوہاب تمہاری آزادیوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ بات لگتی ہوئی تھی اس کے دل میں جم گئی۔ اس نے فوراً عثمان بن معمر امیر عیینہ کو تہدید آمیز انداز میں لکھا:

"یہ مطوع[2] جو تمہارے ہاں مقیم ہے، اس نے ایسے ایسے ..... کام کئے ہیں"۔

---

[1] روضۃ الافکار، جلد ۲ ص ۳-۲ عنوان المجد ص ۱۔

[2] اہل نجد کی زبان میں مولوی اور فقیہ کو مُطوّع کہتے ہیں جمع مطاوعہ استعمال ہوتی ہے موحدین کی نئی منظم برادری اخوان میں بھی مبلغوں کی جماعت مطاوعہ کہلاتی ہے۔

اُسے قتل کرو، ورنہ تمہیں ہمارے ہاں سے جو کچھ ملتا ہے۔ وہ سب روک دیا جائے گا۔"

چونکہ وہ رقم کافی تھی۔ یعنی مال و متاع کے علاوہ بارہ سو دینار سالانہ ؎ اس وجہ سے وہ ایسا متردد ہوا کہ دنیا کی طمع، توحید کی حمایت پر غالب آنے لگی۔ ابھی اس کا سینہ دعوتِ توحید کا محرم نہیں بنا تھا، نہ اُسے یہ معلوم تھا کہ حق کا ساتھ دینے والوں پر غیب سے کیا کیا انعامات ہوتے ہیں؟ اسی حیص بیص میں اس نے شیخ کو سلیمان حاکم احساء کے پیام کی اطلاع دی۔ شیخ نے اُسے تسلی دینا چاہی اور پورے یقین کے ساتھ اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ابنِ بشر کی زبانی شیخؒ کے یہ الفاظ سننے کے لائق ہیں:

إنّ هذا الذي انا قمت به ودعوت اليه كلمة لا اله الا الله واركان الاسلام والامر بالمعروف والنهي عن المنكر فان انت تمسكت به ونصرته فان الله سبحانه يظهرك على اعدائك فلا يزعجك سليمان ولا يفزعك ؎ ... الخ

میں جو اس چیز کو لے کر کھڑا ہوا ہوں اور اس کی دعوت دی ہے وہ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ، ارکان اسلام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر (کی دعوت) ہے۔ اگر تم اس کو مضبوط پکڑ لو اور اس کی مدد کرو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے دشمنوں پر غالب کرے گا۔ سلیمان کی وجہ سے تمہیں پریشان ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

؎ عنوان المجد ص ۱۰

شیخ نے ہر طرح کوشش کی، پر جب زوالِ دنیا کا خوف قلب پر طاری ہو جائے، تو پھر کوئی فہمائش کام نہیں کرتی۔ یہ شیخ کی مؤثر اور پُر امید نصیحت سے پہلی مرتبہ تو وہ رُک گیا لیکن پھر اس سے نہ رہا گیا؛ اور شیخ کے پاس دوبارہ کہلا بھیجا:

"سلیمان نے ہمیں آپ کے قتل کا حکم دیا ہے اور ہم ہیں اس کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں۔ نیز یہ ہماری مروت سے بعید ہے کہ آپ کو اپنے گھر میں تہِ تیغ کریں۔ اس لئے آپ آزاد ہیں، ہمارا علاقہ چھوڑ دیں۔" (عنوان ص ۱۱)

یہ پیام دے کر اپنے ایک سپاہی فرید الظفیری کی ہمراہی میں عُیینہ کے حدود سے باہر کر دیا۔ اس "اخراج" کی داستان بھی عبرت انگیز اور پُر درد ہے۔ ریگستانِ عرب کی سخت دھوپ؛ شیخ آگے آگے پیادہ پا، ہاتھ میں صرف ایک پنکھا، اور پیچھے پیچھے فرید گھوڑے پہ سوار"۔ ابن بشر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ابن معمر نے درپردہ شیخ کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔ شیخ آگے آگے من یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً و یرزقہ من حیث لا یحتسب کا ورد کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ سپاہی نے راستہ میں بات نہیں کی۔ جب اُس نے قتل کا ارادہ کیا، تو خود اس کے بیان کے مطابق کسی غیبی طاقت نے اس کا ہاتھ روک لیا، اور اس پر رعب طاری ہو گیا۔ اور اسی عالم میں وہ اُلٹے پاؤں عیینہ کی طرف واپس ہو گیا۔ صداقت کا اُس پہ کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ سچ مچ اُسے اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی۔

درعیہ میں ۱۱۵۷ھ — ابن معمر کے حدود سے نکل کر شیخ نے درعیہ کا رُخ کیا، اور عصر کے وقت وہاں پہنچے۔ پہلے وہ عبداللہ بن عبدالرحمان بن سویلم العریني کے گھر اترے

اور پھر اپنے ایک شاگرد احمد بن سویلم کے ہاں منتقل ہو گئے۔ خبر پاتے ہی امیر درعیہ محمد بن سعود اپنے بھائیوں، مشاری اور ثُنیّان کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوا۔ اور سب نے مل کر شیخ کو امداد اور فرماں برداری کا یقین دلایا۔[1]

یہ مختصر روداد ابنِ غنام سے منقول ہے۔ ابنِ بشر نے اس اہم واقعہ کو جسے شیخ رح کی تبلیغی زندگی میں خاص اہمیّت حاصل ہے، ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ابنِ غنام کے بعد ہم ابنِ بشر کی روایت بھی ذیل میں درج کرتے ہیں:

"شیخ درعیہ عصر کے وقت پہنچے، جہاں وہ ایک خوش بخت انسان محمد بن سویلم العریني کے گھر اترے۔ بیچارہ عربی اخلاق سے مجبور ہو کر کچھ نہ بولا، پر امیر کے خوف سے اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ شیخ نے نصیحت کی اور تسکین دی:

سیجعل اللہ لنا و لک فرجاً و مخرجاً۔"

امیر محمد بن سعود کی معاونت ابنِ سویلم کے گھر ٹھہرے، تو وہ دعوتِ توحید کا مرکز بن گیا۔ لوگ چھپ چھپ کر آنے لگے۔ اہلِ علم خاص طور پر مستفید ہوتے۔ لیکن یہ صورت قابلِ اطمینان نہ تھی۔ شیخ نے امیر سے سلسلہ جنبانی کرنا چاہی اور امیر کے بھائیوں مشاری اور ثُنیّان سے گفتگو کی۔ انھوں نے پہلے امیر کی بیوی موضیٰ بنت ابی وحطان سے جو نہایت ذی فہم اور متدین خاتون تھی، شیخ کے علم و فضل کی تعریف کی اور اسے امیر سے سلسلہ جنبانی پر آمادہ کیا۔ قدرت کو یوں ہی کرنا تھا۔ موضیٰ کے دل پر خود بخود شیخ کے علم و فضل کا سکہ جم گیا۔ اس نے امیر سے عرض کی:

"اللہ نے یہ نعمت تمھارے ہاں بھیج دی ہے، اٹھو اور اس کی مدد کرو۔ تمھاری

---

[1] روضۃ الافکار ج: ۲ ص ۴

دنیا و آخرت دونوں سنور جائیں گی"۔

امیر محمد بن سعود، جو شیخ کی دعوت سے پہلے بھی حسن اخلاق میں مشہور تھا، اپنی بیوی کی گفتگو سے متأثر ہوا اور اس کے دل میں شیخ کی محبت گھر کر گئی۔ سب کے اصرار سے اس نے ملنے میں پہل کی اور اخلاق و عقیدت سے پذیرائی کی۔ شیخ نے جواب میں اپنی دعوت کے اہم اصول (کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد) پر مختصر سی تقریر کی اور اہلِ نجد کی برائیوں سے آگاہ کیا اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ امیر متأثر ہوا اور بے ساختہ بول اٹھا:

"اے شیخ! یہ تو بلاشبہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے۔ میں آپ کی امداد و اطاعت اور مخالفینِ توحید سے جہاد کے لئے تیار ہوں، لیکن میری دو شرطیں ہیں:۔

۱۔ اگر ہم نے آپ کی مدد کی اور اللہ نے ہمیں فتح دی، تو آپ ہمارا ساتھ نہ چھوڑیں۔

۲۔ اہلِ درعیہ سے فصل کے وقت میں کچھ مقررہ محصول لیتا ہوں، آپ مجھے اس سے نہ روکیں"۔

شیخ نے جواب دیا۔

"پہلی شرط بسر و چشم منظور ہے، ہاتھ لاؤ:- الدم بالدم والھدم بالھدم (میرا خون تمہارا خون اور میری تباہی تمہاری تباہی) رہی دوسری شرط، سو انشاءاللہ تمہیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا کچھ مل جائے گا، کہ اس خراج کا خیال

بھی دل میں نہ آئے گا۔

امیر نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عہد کیا۔ کتاب و سنت کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے کی آمادگی ظاہر کی۔ یہ ۱۱۵۷ھ[۱] یا ۱۱۵۸ھ کا ذکر ہے۔ امیر کا بیعت کرنا تھا کہ جوق جوق لوگ استفادہ اور تجدید ایمان و اعمال کے لئے آنے لگے۔ عُیینہ کے پرانے فیض یافتہ اور ہم نشین جن کے دلوں میں شیخ کی دعوت گھر کر چکی تھی، درعیہ آ گئے۔ ان آنے والوں میں خود عثمان بن معمر رئیس عیینہ کے بعض عزیز بھی تھے۔

ارادت مندوں کا پہلا گروہ یوں تو عیینہ ہی کے دورِ قیام میں شیخ کی طرف لوگ کھنچنے لگے تھے، لیکن ایک عرصہ تک بدعات اور تاریکی میں گھرے رہنے کے بعد عام طور پر خلقت قبولِ حق میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی تھی۔ درعیہ کے قیام اور امیر محمد بن سعود کی نیک نامی نے دعوت کی کامیابی کے لئے اچھی زمین تیار کر دی۔ جن خوش قسمت لوگوں نے آغازِ کار ہی میں جوش و خروش کے ساتھ دعوت پر لبیک کہا اور اس سلسلہ میں خود بھی ابتلاء و محن سے دوچار ہوئے، ان میں بعض نام ابن غنام کی عنایت سے ہم تک پہنچ گئے ہیں۔

خاندانی اور باوجاہت لوگوں میں محمد بن سعود کے تین بھائیوں مشاری[۲]

---

۱ ابن غنام ان سب واقعات کا مختصر ذکر کرتا ہے اور ۱۱۵۷ھ کے حدود میں۔ "کانت ہذہ الامور فی حدود سنۃ سبع و خمسین بعد المائۃ والالف من الہجرۃ" (ج ۲ ص ۴) ابن بشر نے انتقال درعیہ کی تاریخ ۱۱۵۸ھ لکھی ہے (ص ۱۵) اور تفصیلات "عنوان المجد" ہی سے ماخوذ ہیں۔ (ج ۱ ص ۱۲-۱۱) ۲ یوں تو اس دعوت اور پھر آگے چل کر جہاد و قتال کے سلسلہ

ثنیان اور فرحان کے نام پہلے آتے ہیں۔ اہل علم میں احمد بن سویلم اور عیسیٰ بن قاسم زیادہ ممتاز تھے، اور عام رسوخ واثر کے اعتبار سے محمد الحزیمی، عبداللہ بن دُغیشر، سلیمان ابوشیقیری، محمد بن حسین کے نام آج تک زبان زد ہیں۔ فلبی (ص ۱۳-۱۴) کے بیان کے مطابق:۔

"یہ وہابیت کے پہلے بہادر کارکن تھے، ان کے نام آج تک عزت سے لئے جاتے ہیں اور ان کی اولاد سلطان کے دربار میں اعزاز کی مستحق سمجھی جاتی ہے۔"

ابن معمر کی ندامت و پشیمانی دعوت کی روز افزوں مقبولیت کی خبر پاکر ابن معمر سے نہ رہا گیا۔ اسے اپنے پہلے طرزِ عمل پر بڑی پشیمانی ہوئی۔ اور شیخ کی خدمت میں حاضر ہوکر معذرت کی، ساتھ ساتھ عیینہ واپس چلنے کی درخواست بھی کی۔ شیخ نے جواب میں صاف کہا۔

"اب یہ امیر ابنِ سعود کے اختیار میں ہے۔ ان کی اجازت ہو تو میں تیار ہوں۔ ورنہ انہیں چھوڑ کر اب کسی دوسرے کی رفاقت منظور نہیں۔"

یہ واضح جواب پاکر ابنِ معمر نے خود میزبان محمد بن سعود سے اجازت طلب کی، لیکن وہ یہ نعمتِ بیش بہا کسی دام پر اپنے گھر سے الگ کرنے کو تیار نہ تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶) میں امیر محمد بن سعود اور ان کے پورے گھرانے نے نمایاں کام کئے، لیکن ہمیں یہاں بحث صرف شیخ کی دعوت سے ہے، اور اس سلسلے میں ثنیان بن سعود (ف ۱۱۸۶ھ) اور مشاری بن سعود (ف ۱۱۸۹ھ) زیادہ ممتاز ہیں۔ مشاری نے بھائی کی بڑی امداد کی، اور ان کے بیٹے حسن بن مشاری نے لڑائیوں میں شمشیر آبدار کے خوب جوہر دکھلائے، ثنیان بن سعود زاہد اور عفیف النفس تھے۔ گو وہ بینائی سے محروم تھے، لیکن ان کی بصیرت بڑھی ہوئی تھی۔ اصل میں محمد بن سعود ان ہی کے مشورہ سے شیخ کی امداد پر کمربستہ ہوئے (روضۃ الافکار ج ۲ ص ۱۰۱-۹۴، عنوان المجد جلد ۱ ص ۱۰-۹)

دورِ عمل شیخ کی تشریف آوری سے پہلے درعیہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جہاں جہالت کی گرم بازاری تھی۔ شیخ نے سب سے پہلے وعظ و درس کے حلقے قائم کئے، اور خود صبح سے شام تک آنے والوں کو کتاب و سنت کی تعلیم دیتے، اور اپنی دعوت، دعوتِ توحید و اخلاص فی عبادۃ اللہ کی اہم اور ضروری چیزیں ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے۔ شیخ کی جاذب شخصیت اور دعوت کی سچائی نے فوری اثر دکھایا۔ مجالسِ وعظ و تذکیر سے یہ فائدہ ہوا کہ دلوں سے ما الفینا علیہ آباءنا کا زنگ دور ہونے لگا، اور رسم و رواج کے خرافات کو وہ صرف قرآن و حدیث کی روشنی میں دیکھنے لگے۔

ان مجالس کی کشش دور دور سے تشنگانِ علم کو درعیہ لے آئی، جہاں رزق کی تنگی کے باعث یہ علم و عمل کے پیاسے راتوں کو کسی حرفت کے ذریعہ قوت لایموت حاصل کرنے کی کوشش کرتے، اور دن کا وقت اللہ کی کتاب اور اس کے برگزیدہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بتائی ہوئی باتوں کے سننے کے لئے وقف رہتا۔ شاگردوں اور ارادت مندوں کی زیادتی اور ان کی میزبانی کے باعث شیخ برابر مقروض رہتے۔ بہرحال دعوت کی مقبولیت دن بدن بڑھتی گئی، اور آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا[1]۔

دعوت کی وسعت اہلِ درعیہ تو شیخ کے قدم رکھتے ہی عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے، لیکن وہ اس پر قانع نہ تھے۔ نجد کے مختلف حصوں اور ان کے سرداروں کو ترغیب دیتے، اور اپنی دعوت سے آگاہ کرتے۔ گو مخالفتیں بھی ہوئیں، اور

---

[1] عنوان المجد ص ۱۵–۱۳

افترا پردازیوں میں بھی کوئی کمی نہیں کی گئی۔ پھر بھی حق کی آواز بلند ہوتی گئی، اور آہستہ آہستہ اس کے ثمرات بھی ظاہر ہونے لگے۔ قیام درعیہ کے دوسرے ہی سال (۱۱۵۸ھ یا ۱۱۵۹ھ) امیر عُیینہ نے آکر بیعت کی۔ اور حدود شرعیہ کے نفاذ کا عہد کیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اہلِ حُریملا نے بھی بیعت کی۔ ادھر امیر محمد بن سعود کی معاونت کا یہ عالم تھا، کہ خمس اور زکوٰۃ کی تمام رقمیں شیخ کے ہاتھ میں دی جاتیں، اور وہ انہیں بے دریغ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے۔ امیر ابن سعود اور ان کے جانشین عبد العزیز بن محمد بن سعود (جو ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد منصب امارت پر متمکن ہوئے) شیخ کی اجازت کے بغیر ادنیٰ تصرف روا نہیں رکھتے تھے با ایں ہمہ شیخ کی للّٰہیت کا یہ حال تھا، کہ وہ اپنے پاس ایک حبہ بھی نہیں رکھتے، اور جو کچھ آتا، سب اللہ کی راہ میں صرف کر دیتے۔

ابن بشر کا بیان ہے (ص ۱۵) "کہ خمس اور زکوٰۃ سے جو کچھ آتا، وہ فوراً تقسیم کر دیتے۔ ان کی اس فراخ دستی کا نتیجہ یہ تھا، کہ وہ برابر مقروض رہتے، صرف فتح ریاض[1] (۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء) کے وقت ان پر چالیس ہزار قرض تھا، جو مالِ غنیمت سے ادا کیا گیا"

یہ سارا قرض اور یہ تمام دریا دلی تبلیغ کے سلسلہ میں ہوتی تھی، جو فتح ریاض تک برابر جاری رہی۔ فتح ریاض کے بعد شیخ کو اپنی دعوت کی کامیابی کے متعلق ایک

---

[1] عنوان المجد (ص ۵۱) ریاض پر مکمل قبضہ ربیع الآخر ۱۱۸۷ھ کے اواخر میں یا اس کے بعد ہوا (جولائی ۱۷۷۳ء)

گونہ اطمینان ہو گیا، تو انہوں نے امیر عبدالعزیز کو سیاہ و سپید کا مالک بنا کر اپنے آپ کو بیت المال کے انتظامات سے بالکل الگ کر لیا۔ اور اپنی تمام توجہ تعلیم و تدریس پر مرکوز کر دی، لیکن عبدالعزیز شیخ کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرتے۔ ہر کام میں ان کی رائے مقدم تھی۔

تبلیغ عام اب تک شیخ کی دعوت نجد کے اضلاع تک محدود رہی، لیکن دعوت عام تھی۔ اصلاح کی ضرورت صرف نجد ہی میں نہ تھی، تمام اسلامی دنیا انحطاط کے عالم میں تھی۔ اصلاح کی ابتدا گھر سے ہوتی ہے، اس لئے قدرتی طور پر عیینہ، حریملا، درعیہ اور عارض کے دوسرے قصبے شیخ کی دعوت کے اولین مرکز بنے۔ لیکن جونہی ان علاقوں میں زندگی کی علامتیں ظاہر ہوئیں، شیخ نے اپنی دعوت کا حلقہ وسیع کیا، اور دور دور شہروں کے علماء، امراء اور قضاۃ کے پاس تبلیغی خطوط بھیجے، اور انہیں اپنی دعوت کے قبول کرنے پر آمادہ کرنے لگے۔ پر کم تھے جنہوں نے شروع شروع دعوت قبول کی، زیادہ وہ تھے، جنہوں نے شیخ کی دعوت کا مذاق اڑایا۔ کسی نے جاہل کہا، کسی نے جادوگر، اور کسی نے ایسی تہمتیں لگائیں، جن سے وہ پاک تھے۔

دعوت پر لبیک کہنے والوں، اور اس کی حمایت کرنے والوں میں سب سے زیادہ ممتاز صنعاء (یمن) کے مجتہد النظر عالم امیر محمد بن اسماعیل[1] (ف ۱۱۸۲ھ) تھے، جنہوں نے

---

[1] امیر محمد بن اسماعیل یمنی صنعانی اپنے وقت کے امام اور مجتہد مطلق کا رتبہ رکھتے تھے۔ ولادت شب جمعہ، ۵ جمادی الآخرہ ۱۱۹۹ھ / ۱۶۸۸ء کحلان میں ہوئی۔ وفات کی تاریخ سہ شنبہ ۳۰ شعبان ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۹ء ہے۔ ان کے مختصر توحیدی رسالہ تطہیر الاعتقاد عن اوران الالحاد کا حوالہ آچکا ہے۔ آگے بھی ذکر

شیخ کی دعوت پاکر اپنا مشہور وجد آفریں قصیدہ لکھا، جو اہل علم میں بہت مقبول ہوا۔ اس کا مطلع یہ ہے:۔

سلامی علی نجد ومن حلّ با لنجد | وان کان تسلیمی علی البعد لا یُجدی
(میرا سلام نجد کو اور ان کو جو نجد میں مقیم ہیں | اگرچہ اتنی دوری پر میرا اسلام بھیجنا کارگر نہیں ہو سکتا)

اس قصیدہ میں شیخ کی مدح، بدعات کی برائی، اور وحدۃ الوجود کے عقیدہ کی پرزور تردید اور بہت سی مفید باتیں ہیں۔

امیر محمد بن اسماعیل کو شیخ کی دعوت سے زیادہ خوشی اس لئے ہوئی، کہ وہ اس سے پہلے اپنے کو اس باب میں منفرد خیال کرتے تھے، جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے:۔

لقد سرّنی ماجاءنی من طریقه | وکنت اری هذی الطریقة لی وحدی
(ان کے طریق (دعوت) کا حال سن کر مجھے خوشی ہوئی + پہلے میں اس طریق کا میں اپنے کو منفرد سمجھتا تھا)

شیخ کو امیر یمنی کے قصیدے اور تائید سے بڑی تقویت ہوئی۔ بعض رسالوں میں انہوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے[۱]۔

شیخ کے بھائی سلیمان بن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۸ھ) جو اپنے باپ کی جگہ حریملاء کے قاضی تھے، اوّل اوّل ان کے مخالف ہوئے۔ اور ان کی تردید میں رسالے بھی لکھے جو غلط بیانیوں سے پُر تھے۔ ابن غنام کی زبان میں انہوں نے "حسداً وغیرۃً" مخالفت کی

(بقیہ حاشیہ ص۴۵) آئے گا۔ تصنیفات کے لئے ملاحظہ ہو بروکلمن (ذیل: ۲، ۵۵۶)، دیگر حالات کے لئے البدر الطالع (ج ۲: ص ۱۳۳-۹) اور عنوان المجد (ج ۱: ص ۶-۵۳)

[۱] ابن غنام (ج ۲: ص ۱۷-۵۶-۴)

تھی یہ شیخ نے ان کی تردید میں رسالے بھی لکھے، لیکن آخر میں انہیں توفیق ہوئی اور اپنے بھائی کے پاس تائب ہو کر آئے۔[1]

"رجع الی اخیہ بالدرعیۃ تائباً سنۃ ۱۱۹۰، فاحسن الیہ الشیخ واکرم مثواہ۔"

(۱۱۹۰ھ میں تائب ہو کر اپنے بھائی کے پاس درعیہ آئے، تو شیخ حسن سلوک سے پیش آئے اور ان کی آؤ بھگت کی۔)

سلیمان بن عبدالوہاب کا رسالہ الصواعق الالٰہیۃ فی الرد علی الوھابیۃ کے نام سے چھپا ہوا ملتا ہے۔ مخالف اس رسالہ کا ذکر کرتے ہیں، لیکن سلیمان کی توبہ اور "رجوع" کا نام بھی زبان پر نہیں لاتے۔

سلیمان بن عبدالوہاب کی مخالفت ۱۱۶۷ھ میں بہت تیز ہو گئی تھی۔ اسی سال شیخ نے اطراف و اکناف سے مسلمانوں کو جمع کیا، اور ان کے سامنے اپنی دعوت پر واضح اور کھلی ہوئی تقریر کی۔

دعوت کی بنیاد اور اس کی موافقت و مخالفت کا ذکر آگے تفصیل سے آئے گا۔ یہاں صرف دعوت کی عمومیت دکھانا تھی۔ تشنگانِ علم تو درعیہ جوق جوق آتے ہی تھے۔ شیخ کے تبلیغی رسالے، مبلغین اور ہدایت نامے بھی اطراف و اکناف میں پھیل رہے تھے۔

ابن دواس اور دوسرے مخالف | درعیہ کی اقامت کے تیسرے ہی سال (۱۱۵۹ھ)

---

[1] ابن غنام ج ۲ ص ۱۰۸

دہام بن دواس حاکمِ ریاض کی زیادتیوں نے شیخ اور امیر محمد بن سعود کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ریاض اور منفوحہ کے موحدین کو صرف اتباعِ شیخ کے جرم میں اس نے گوناگوں زیادتیوں کا شکار بنایا۔ مجبوراً شیخ نے بھی اپنے پیروؤں کو مقابلہ اور مقاتلہ کا حکم دیا۔ پھر کیا تھا، امیر محمد بن سعود، ان کے بھائیوں اور بیٹوں نے معاندین کی خوب خبر لی اور جنگ و قتال کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔

صرف دہام بن دواس حاکمِ ریاض سے پچیس تیس سال چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ قائم رہا۔ ۱۱۵۹ھ سے ۱۱۸۷ھ تک دونوں قوتیں برسرِ پیکار رہیں۔ آخر ۱۱۸۷ھ میں عبدالعزیز محمد بن سعود کے تازہ حملہ کی خبر پاکر ابن دواس شہر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور قلبِ نجد (ریاض) پر امیر عبدالعزیز کا مکمل قبضہ ہوگیا۔[۱]

اسی دوران میں آس پاس کی دوسری طاقتیں بھی حملہ آور ہوئیں۔ عثمان بن معمر حاکمِ عیینہ نے بار بار دھوکا دیا۔ اہلِ نجد اور شیخ کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر مخالفوں نے اوچھے ہتھیار استعمال کرنا شروع کئے۔ سلیمان بن محمد بن سحیم نے شیخ پر بہتان باندھے۔ اور ان کی طرف قسم قسم کی برائیاں منسوب کیں۔ خلیج فارس، احساء اور دوسرے ملکوں کو اس نے رسالے لکھ کر بھیجے۔ شیخ نے ان میں سے ایک رسالہ کا مفصل جواب دیا ہے۔ افترا پردازیوں اور جواب کی نوعیت پر آگے گفتگو ہوگی۔ ایک طرف یہ نام نہاد علم و عمل کے اجارہ دار تھے، دوسری جانب چھوٹے چھوٹے علاقوں کے سردار، اپنی اپنی خود مختاری کے بچاؤ کی خاطر ان افترا پردازوں

۱؎ Arabia از فلبی (ص ۲۵-۱۳)

کا ہاتھ بٹانے لگے۔[1]

پھر ان تمام رکاوٹوں کے باوجود دعوت کا حلقہ وسیع ہوتا گیا اور مُطَوّع ریعہ سے نکل کر نجد کے تمام علاقوں میں پھیل گئے۔ تا آنکہ کم از کم قلب جزیرہ میں محمد بن عبداللہ (بِنَفْسِی) بابی دامی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات اپنی اصلی صورت میں جلوہ گر ہو گئیں۔

وفات | شیخ نے پچاس[۵] سال مسلسل دعوت و تبلیغ کے بعد شوال یا ذی قعدہ ۱۲۰۶ھ (جون یا جولائی ۱۷۹۲ء) میں رحلت کی۔[2]

دنیا و مافیہا سے بے نیاز عجیب ہستی تھی۔ کم لوگوں کو اپنی زندگی میں ایسی قبولیت حاصل ہوتی ہوگی۔

شیخ کے شاگرد ابن غنام[3] نے ایک پُردرد مرثیہ لکھا تھا، جس کا مطلع یہ ہے:

الی اللہ فی کشف الشدائد نفزع وليس الی غیر المہیمن مفزع

محمد حامد فقی[4] نے قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) کا بھی ایک مرثیہ نقل کیا ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

---

[1] ابن غنام ۱: ۲۷ - ۲۸؛ ۱۶۷ - ۱۴۲)

[2] ابن غنام جلد ۲ صـ۷۴؛ ابن بشر جلد ۱ صـ۹۵۔ باقی اکثر مغربی اور شرقی مورخوں نے تاریخ وفات میں غلطی کی ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو ابروکلمن (ذیل: ۲: ۵۳۰)؛ مارگولیتھ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: ج ۴ صـ۱۰۸۶)؛ لبیب بتنونی (الرحلۃ الحجازیۃ صـ۸۴)۔

[3] روضۃ الافکار (صـ۱۷۵)

[4] اثر الدعوۃ الوہابیۃ فی جزیرۃ العرب صـ۸۰ - ۷۸

مصاب دھا قلبی فاذکی غلائلی　　　واصمی بسہم الافتجاع مقاتلی

ایک بڑی خصوصیت | تاریخِ اسلام میں بارہا ایسا ہوا ہے۔ کہ غیر معمولی شخصیتیں مہدویت یا مسیحیت کے لباس میں جلوہ گر ہوئیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مفید ہونے کے بدلے دین اور اس کی وحدت کے لئے انتہائی مضر ثابت ہوئیں۔ ہم اسے شیخ الاسلام کی دعوت کی انتہائی کامیابی خیال کرتے ہیں، کہ ان کی تعلیمات اور ان کے پیروان دہام سے بالکل الگ تھلگ اور خطرات سے بال بال بچے رہے۔ بعض "اہل علم"[۱] نے افترا پردازیاں کیں، پر ان کے ماننے والے اور جانشین اپنے عقیدوں میں اتنے صاف اور واضح تھے، کہ ان کی ایک نہ چلی اور نجد کے موحد پر کوششوں کے باوجود ان کی تصنیفات اور رسالوں سے کوئی ایسا الزام نہ تراشا جا سکا۔ ان کی کتابیں لکھی ہوئی اور دو دو چار کے انداز میں اپنے لکھنے والے کی جرأت اور صداقت کی شہادت دیتی ہیں۔ پوری کتاب التوحید پڑھ جائیے، کوئی پیچیدگی، تصوف، توہم، دور از کار باتیں منطقیانہ استدلال، یونانی کج بحثی، ان میں کسی چیز کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ ملے گا۔

دوسری خصوصیت | محمد بن عبدالوہاب ایک ٹھیٹھ عالم تھے۔ پر ان کی نگاہیں بڑی دور رس تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دعوت کے ثمرات دیکھے، دینی ثمرات بھی، اور دنیوی پھل پھول بھی۔ ان کی زندگی میں نجد کا پورا علاقہ مفتوح ہو چکا تھا۔ امیر نجد اور اس کے اہلِ خاندان قدموں پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتے تھے۔ سارا جاہ و حشم شیخ کی جوتیوں کا صدقہ تھا۔ مجاہد اور عام قوم ان ہی کو جانتی تھی، اور ان ہی پر فریفتہ تھی۔ وہ چاہتے

---

۱ احمد زینی دحلان (ف ۱۳۰۴ھ) کی الدرر السنیہ (ص ۴۶) ملاحظہ ہو۔

تو سلطنت میں اپنی اولاد کا حصہ رکھتے ۔ خود زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ۔ لیکن انہوں نے اپنے کو ان ذمہ داریوں سے یکسر الگ رکھا ۔ امیر محمد بن سعود اور ان کے جانشین امیر عبدالعزیز ان کے مشوروں کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے اور نہ کرنا چاہتے ۔ سارا مالِ غنیمت ان کے قدموں پر لاکر ڈال دیا جاتا ۔ لیکن اس اللہ کے بندے نے اپنے کام سے کام رکھا ۔ جب تک ضرورت رہی دخل دیتے رہے جونہی انہوں نے محسوس کیا کہ اب دعوت کی بنیادیں استوار ہو گئی ہیں ، اپنے کو ملکی انتظامات اور مالِ غنیمت کے نظم و نسق سے یکسر الگ کر لیا ۔ شیخ کی اس بے نفسی کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اُن کی اولاد بھی دنیاوی جاہ و حشم سے الگ دین کی خدمت میں مصروف رہی ۔ اور آج تک جب کہ شیخ کی وفات کو ڈیڑھ سو برس ہو گئے کبھی ان کی اولاد تخت و تاج کے لئے آلِ سعود سے دست بہ گریباں نہیں ہوتی ۔

اولاد و احفاد : شیخ کے شاگردوں اور ان کے حلقۂ درس و ارشاد سے مستفید ہونے والوں کا شمار تو تقریباً ناممکن ہے ، جس درس میں پچاس ساٹھ سال مسلسل خوشہ چینوں کا تانتا بندھا رہا ہو ۔ اس کی وسعت و ہمہ گیری کا کیا ٹھکانا ؟ اگر شاگردوں کا ذکر کیا بھی جائے ، تو تذکروں کی کم یابی الگ دامن پکڑتی ہے ۔ اس لئے ہم شیخ کے شاگردوں میں صرف ان کی اولاد و احفاد کا تذکرہ کریں گے ، جو بجا طور پر اب آلِ شیخ کے نام سے پکارے جاتے ہیں ، اور یہی ان کا لقب ہے ۔ یہ شیخ کی خوش نصیبی تھی ، کہ انھوں نے اپنے ایسے جانشین چھوڑے ، جو بالکل ان ہی کے طریقہ کے مطابق سنت رسول کے تتبع اور تبلیغ و تدریس میں مشغول رہے ، اور اس سے زیادہ مسرت و اعجاب کی بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ

آج تک منقطع نہیں ہوا۔ آج تک ان کی اولاد علم و عمل میں پورے نجد میں ممتاز ہے۔ شیخ کثیر العیال تھے۔ بعض لڑکے ان کی زندگی ہی میں وفات پاگئے، وفات کے وقت انھوں نے چار بیٹے چھوڑے، حسینؒ، عبداللہؒ، علیؒ، ابراہیمؒ۔

ابن بشر کہتا ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ان کے درس میں طلبہ کا اتنا ہجوم دیکھا کہ اگر کسی سے بیان کیا جائے، تو شاید اُسے یقین نہ آئے۔

"ان میں سے ہر ایک کے گھر کے پاس ایک مدرسہ تھا، جس میں پردیسی طالب علم رہا کرتے اور ان کے مصارف بیت المال سے ادا ہوتے۔ یہ لوگ شب و روز تحصیلِ علم میں مصروف رہتے۔"[1]

ان میں حسین بڑے تھے، اور شیخ کے بعد اصلی جانشین وہی سمجھے جاتے، درعیہ کے قضا پر مامور تھے۔ درعیہ کی جامع مسجد کی امامت بھی ان کے سپرد تھی۔ ۱۲۲۴ھ میں وفات پائی[2]۔ ان کے متعدد بیٹے تھے، اور سب کے سب علم و عمل میں ممتاز۔ ابنِ بشر نے علی، احمد، حسن، عبدالرحمان، عبدالملک کے نام گنائے ہیں۔ ان میں علی بڑے اور علم میں بڑے ممتاز تھے۔ اس لئے اپنے اعمام کی موجودگی میں منصب قضا پر مامور ہوئے۔ سعود بن عبدالعزیز (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء – ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) عبداللہ بن سعود (مصلوب ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء) ترکی (مقتول ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء) اور فیصل بن ترکی (ف ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء) مختلف امیروں کے عہد میں عہدۂ قضا پر مامور رہے۔ ۱۲۸۰ھ میں وفات پائی۔ محمد زمانہ طالب علمی ہی میں وفات پاگئے۔ ... بن ترکی بن عبداللہ کے زمانہ میں ریاض کے قاضی تھے۔ فقہ میں اچھی دستگاہ تھی۔

۱ـ عنوان المجد، جلد ۱ صـ ۹۳۔ ۲ـ ایضاً جلد ۱ صـ ۱۴۳۔

عمر کم پائی۔ اور ۱۲۴۵ھ میں دار آخرت کو چل بسے۔ عبدالرحمان ترکی اور فیصل دونوں کے دورِ حکومت میں منصب قضا پر فائز ہوئے۔ فقہ، تفسیر اور نحو کے اچھے عالم تھے۔ عبدالملک بن حسین بھی فیصل کے عہد میں حوطہ کے قاضی تھے۔ ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی۔ عبدالرحمان بن حسین، حسن بن حسین، عبدالملک بن حسین، سب کے سب شیخ عبدالرحمان بن حسن بن محمد بن عبدالوہاب سے مستفید ہوئے (جن کا ذکر آگے آتا ہے)۔ اسی طرح حسین بن شیخ الاسلام کی اولاد میں حسین بن حمد بن حسین بن شیخ الاسلام (قاضی حریق بہ عہد فیصل)، حسین بن علی بن شیخ الاسلام (قاضی ریاض بہ عہد فیصل) اور عبداللہ بن حسن بن حسین بن شیخ الاسلام بھی شیخ عبدالرحمان بن حسن بن شیخ الاسلام سے مستفید ہوئے۔

شیخ کے دوسرے بیٹے عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب بھی بڑے عالم تھے۔ ان کا شمار علمائے مصنفین میں تھا۔ حسین بن محمد کی وفات کے بعد یہی شیخ الاسلام کے جانشین مانے جاتے تھے۔ خود حسین بن محمد کی زندگی میں اُن کی علمی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ شیخ محمد بن ابراہیم بن عبداللطیف بن عبدالرحمان بن حسن بن محمد بن عبدالوہاب (جو اس وقت علمائے نجد کے سرتاج اور خاندانی روایات کے حامل ہیں) کی روایت کے مطابق عبداللہ بن محمد اپنے بڑے بھائی حسین بن محمد سے بھی علم میں بڑھے ہوئے تھے۔ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں امیر سعود بن عبدالعزیز کے داخلہ مکہ مکرمہ کے وقت یہ ساتھ تھے۔ اور امیر سعود نے اپنی جماعت کے عقائد سے متعلق جو رسالہ تقسیم کرایا تھا، وہ انہیں عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ ۱۲۳۲ھ میں ابراہیم پاشا کے حملہ درعیہ کے وقت موجود تھے، لیکن مصری فوجوں کی وحشت اور غارت گری

آپ سے دیکھی نہ گئی اور تلوار لے کر میدان ہی کو دپڑے:

"فقُتِلَ بسیفہ عبد اللّٰہ بن الشیخ محمد بن عبد الوہاب وانتدب واجتمعوا علیہ[1] الخ"

اور خوب دادِ شجاعت دی، غالباً گرفتار کر کے مصر بھیج دیئے گئے اور وہیں وفات[2] پائی۔ ان کے دو بیٹے سلیمان بن عبد اللہ اور علی بن عبد اللہ سقوطِ درعیہ کے وقت قتل کئے گئے۔ سلیمان ممتاز عالم تھے۔ اپنے والد کی موجودگی میں درعیہ کے قاضی رہے نیز امیر سعود کے دورِ امارت میں کچھ دنوں مکہ مکرمہ میں بھی انھوں نے قضا کے فرائض انجام دیئے۔ امیر سعود بن عبد العزیز کی مجلس میں صحیح بخاری کا درس اُن کے سپرد تھا۔ جو بہت بڑا علمی امتیاز تھا۔ خود عبد اللہ بن شیخ الاسلام امیر سعود کی مجلس میں تفسیر طبری اور ابن کثیر کا درس دیتے تھے۔ ابن بشر خود ان مجلسوں میں شریک رہا ہے۔ اس کے

---

[1] عنوان المجد ج ۱ ص ۲۰۶

[2] ابن بشر شیخ عبد اللہ بن محمد کی بہادری اور قتال کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن شہادت کے بارے میں خاموش ہے۔ دحلان (ص ۲۲۹) سلیمان بن عبد اللہ بن محمد بن عبد الوہاب کے قتل کا ذکر کرتا ہے، لیکن عبد اللہ کے بارے میں خاموش ہے۔

ابن بشر کا ایک دوسرا بیان عبد اللہ بن محمد کے قتل کی تردید کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"عبد اللہ مذکور کے ایک بیٹے عبد الرحمان تھے، جو ان ہی کے ساتھ کم سنی ہی میں مصر جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت ازہر کے رواق حنابلہ میں مقیم ہیں اور اُن کے پاس طلبہ آتے جاتے ہیں، اور ان میں علمی ذوق ہے (جلد ۱ ص ۹۳) (ریاض میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان کی وفات ۱۲۴۲ھ میں ہوئی۔ ایڈیٹر بھی وہاں اتفاق پایا کہ۔ وہ شیخ کی اولاد میں علم و فضل میں سب سے بڑھے ہوئے تھے)

بیان سے ان علمی مجلسوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے[1]۔ اُس نے ان کے طریقہ تعلیم و تحدیث کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بہت نمایاں تھے، اسی لئے دحلان[2] نے انہیں ان کے والد سے "زیادہ متعصب" بتایا ہے۔ کتاب التوحید کی ایک شرح بھی لکھی تھی، جو ابن بشر کے بیان کے مطابق نا مکمل رہی[3]۔ اپنے والد، شیخ احمد بن ناصر بن معمر (ف ۱۲۲۵ھ) اور شیخ حسین بن غنام (ف ۱۲۲۵ھ) سے تحصیل کی تھی۔ ۱۲۳۳ھ کے اواخر میں قتل کئے گئے۔ اُن کے قتل کا واقعہ بھی عجیب دردناک ہے، آگے تفصیل آئے گی۔ اس کے علاوہ ان کی ایک دوسری تالیف (کتاب التوضیح عن توحید الخلاق فی جواب اھل العراق مطبوعہ ۱۳۱۹ھ) ہمارے پیش نظر ہے، جو اُن کی وسعتِ علم کی شاہد ہے۔ بروکلمن (ذیل ج ۲ ص ۵۳۲) نے ان کی دو کتابیں اور ذکر کی ہیں (۱) اوثق عری الایمان (ب) مسائل، جو راقم کی نظر سے نہیں گزریں۔ مجموعۃ التوحید المکیۃ (مطبوعہ ۱۳۴۳ھ) میں بھی شیخ سلیمان بن عبد اللہ کا ایک رسالہ بعض اہم مسائل کے جواب میں شامل ہے۔ ممکن ہے بروکلمن کا درج کردہ رسالہ مسائل اور یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ علی بن عبد اللہ بن الشیخ ۱۲۳۴ھ میں درعیہ کے قریب شہید ہوئے۔ حدیث و تفسیر میں اچھی دستگاہ تھی۔ انہوں نے بھی کتاب التوحید کی

---

[1] عنوان المجد ج ۱ ص ۲۰۹، ۲۶، ۲۰۰، ۲۱۰ [2] خلاصۃ الکلام ص ۲۲۹

[3] شیخ عبد الرحمان بن حسن بن شیخ الاسلام نے یہ شرح مکمل کی، جیسا کہ انہوں نے فتح المجید کے دیباچہ میں تشریح کی ہے۔

ایک شرح لکھی تھی[1]۔ عبداللہ بن شیخ الاسلام کے تیسرے بیٹے عبدالرحمان بن عبداللہ بھی مشہور عالم ہوئے۔ یہ وہی عبدالرحمان ہیں جن کا ذکر اوپر ابن بشر کے حوالے سے آیا ہے۔ مصر میں وفات پائی۔ (۱۲۵۰ھ)۔ حسین بن شیخ الاسلام کے متعدد رسالے اور فتوے مشرقی کتاب خانہ، پٹنہ کے ایک مجموعے میں درج ہیں[2]۔

علی بن شیخ الاسلام بھی ممتاز عالم اور زہد و ورع میں ضرب المثل تھے۔ فقہ و تفسیر میں اچھی دستگاہ تھی۔ قضا کا منصب پیش کیا گیا، لیکن انہوں نے غایت زہد و ورع کی بنا پر قبول نہ کیا۔ ۱۲۴۹ھ میں وفات پائی۔ ان کے لڑکے کم سنی ہی میں انتقال کر گئے۔ صرف محمد بن علی بن شیخ الاسلام پھلے پھولے اور ممتاز عالم ہوئے۔

چوتھے بیٹے ابراہیم مشہور صاحب درس ہوئے۔ ابن بشر نے اُن سے کم سنی میں (۱۲۲۳ھ) کتاب التوحید پڑھی تھی، قضا سے الگ رہے[3]۔ ۱۲۵۱ھ تک مصر میں ان کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے۔

شیخ کے ممتاز شاگردوں میں اُن کے پوتے عبدالرحمان بن حسن بن شیخ الاسلام بھی نجد کے چند ممتاز عالموں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اُن کے والد شیخ کی زندگی ہی میں انتقال کر چکے تھے کم سنی میں اپنے دادا سے کسب علم کیا اور شیخ کے ممتاز شاگردوں احمد بن ناصر بن عثمان بن معمر (ف ۱۲۲۵ھ) اور عبدالعزیز بن عبداللہ الحصین الناصری (ف ۱۲۳۶ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ شیخ عبدالرحمان بن حسن کی حیثیت اپنے خاندان میں علمی مجدد

---

[1] عنوان المجد (ج ۱ ص ۳۳ و ۲۱۵)۔

[2] ملاحظہ ہو کچی فہرست Hand-list نمبر ۲۶۲۵۔ [3] عنوان (ج ۱، ص ۹۳)

کی ہے۔ اُن کا علمی مرتبہ شروع سے مسلّم تھا۔ امیر سعود بن عبد العزیز (ف ۱۲۲۹ھ) اور امیر عبد اللہ بن سعود (مصلوب ۱۲۳۴ھ) کے عہد میں درعیہ کے قاضی رہے۔ شیخ حسین بن شیخ الاسلام کی وفات (۱۲۲۵ھ) کے بعد اس خاندان کے اُن چار[۱] افراد میں یہ بھی تھے۔ جن کی علمی حیثیت مسلم تھی اور پایۂ تخت (درعیہ) کے قضا کا کام ان کے سپرد تھا۔

سقوطِ درعیہ کے وقت (۱۲۳۳ھ) مصر چلے گئے، بلکہ جلا وطن کر دئے گئے تھے۔ جب حالات استوار ہوئے، تو ۱۲۴۱ھ میں نجد واپس آئے، جہاں اُن کی ذات سے پھر ایک بار علم کی گرم بازاری ہوئی اور سینکڑوں اشخاص اُن کے درس میں شریک ہو کر کامیاب نکلے۔ خود شیخ الاسلام کے خاندان کے بیسیوں افراد اُن سے مستفید ہوئے[۲]۔ ترکی بن عبد اللہ (مقتول ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء) اور فیصل بن ترکی (ف ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء) کے عہد میں قاضی القضاۃ اور خواص و عوام کا مرجع بنے رہے۔ ترکی بن عبد اللہ بن محمد بن سعود (مقتول ۱۲۴۹ھ) کی خاص مجلسوں میں درس کی خدمت ان ہی کے سپرد تھی۔ عام طور پر تفسیر ابن جریر کا درس ہوتا۔ فیصل بن ترکی کے عہد میں بھی درس و ارشاد کی خدمت ان ہی کے سپرد تھی۔ سقوط درعیہ سے پہلے اساطینِ اربعہ کی دھوم تھی۔ حالات استوار ہونے کے بعد امیر ترکی بن عبد اللہ

---

۱ اساطین اربعہ جن کا ذکر اوپر آیا، اس ترتیب سے عزت و تقدس کے مستحق سمجھے جاتے تھے:- عبد اللہ بن الشیخ؛ علی بن حسین بن الشیخ۔ عبد الرحمان بن حسن بن الشیخ؛ سلیمان بن عبد اللہ بن الشیخ۔

۲ عنوان (۲:۲۷ ص ۲۲، ۲۰، ۶۵)۔

کے عہد میں صرف عبدالرحمان بن حسن بن الشیخ ، اور علی بن حسین الشیخ رہ گئے۔ ترکی اور فیصل دونوں کے ایام حکومت میں، عبدالرحمان بن حسن اور علی بن حسین کے ساتھ ساتھ عبدالرحمان بن حسین بن الشیخ اور عبدالملک بن حسین کے نام بھی بار بار آتے ہیں۔[1] لیکن فیصل بن ترکی کے آخر دور میں (۱۲۵۰ھ کے بعد) صرف عبدالرحمان بن حسن بن الشیخ کا نام خاص طور پہ آتا ہے۔ اور پھر فیصل کے بالکل آخری دور میں ان کے صاحبزادے عبداللطیف ابن عبدالرحمان قضا اور تدریس پہ فائز نظر آتے ہیں۔

علی بن حسین بن الشیخ نے کافی عمر پائی اور ۱۲۵۷ھ میں رحلت کی۔ بہرحال فیصل بن ترکی کے آخری زمانہ حکومت میں یہ سب سے زیادہ محترم اور مخدوم تھے۔ بڑی عمر پائی۔ ابن بشر نے اپنی کتاب ۱۲۷۰ھ میں لکھی۔ اور ۱۲۶۷ھ کے حوادث پہ ختم کی ہے اس وقت یہ زندہ تھے۔ پالگریو نے اپنی سیاحت کے دوران میں (۱۸۶۲ء / ۱۲۷۹ھ) ریاض میں ان سے اور ان کے صاحبزادے عبداللطیف سے ملاقات کی تھی[2] لیکن اسے غلط فہمی یہ ہوئی کہ وہ انہیں عبداللہ ابن الشیخ کا فرزند سمجھا۔ ۱۲۸۵ھ میں بڑی عمر پاکر وفات پائی۔

ابن بشر نے ان کی متعدد تالیفات اور رسالوں کا ذکر کیا ہے۔ سلیمان بن عبداللہ بن الشیخ (مقتول ۱۲۳۳ھ) کی غیر مکمل شرح کتاب التوحید کی تکمیل بھی ان کے قلم سے ہوئی تھی، جو "فتح المجید فی شرح کتاب التوحید" کے نام سے بار بار چھپ چکی ہے۔[3]

---

[1] عنوان (ج ۲، ص ۷۳، ۹۵، ۸۸)

[2] ج ۱، ص ۳۷۹ Gifford Palgrave (Narrative of a Year's Journey Through Central and Eastern Arabia)

[3] ہمارے پیش نظر اس کا تازہ اڈیشن ہے، جو نہایت صحت و اہتمام کے ساتھ مصر میں چھپا ہے۔

فتح المجید کے علاوہ ان کی دوسری کتاب (قرۃ عیون الموحدین فی تحقیق دعوۃ الانبیاء والمرسلین) بھی چھپ گئی ہے۔ یہ اصل میں کتاب التوحید ہی کے حواشی ہیں۔ محمد حامد الفقی (جنھوں نے فتح المجید کا تازہ اڈیشن شائع کیا ہے) نے فتح المجید کے حواشی میں قرۃ عیون الموحدین کے اقتباسات بہ کثرت دیئے ہیں۔ ان کا ایک مختصر رسالہ عنوان المجد میں منقول ہے[1]۔ ابنِ بشر نے ان کے متعدد خطوط کے اقتباسات بھی دیئے ہیں۔ مجموعۃ التوحید المکیہ (۱۳۴۳ھ) میں بھی ان کے حسب ذیل تین رسالے شامل ہیں:-

(۱) رسالۃٌ فی جواب الجہمیۃ (صفحہ ۳۶-۳۲)۔

(۲) رسالۃٌ فی حکم موالاۃ اہل الاشراک (صفحہ ۱۹۹-۱۵۷)

(۳) بیان المحجۃ فی الرد علی صاحب اللجۃ (صفحہ ۲۵۲-۲۰۵)

ان کے صاحبزادوں میں محمد بن عبدالرحمان بن حسن سقوطِ درعیہ کے وقت اپنے دوسرے اہلِ خاندان کی طرح قتل کیے گئے[2]۔

عبداللطیف بن عبدالرحمان ان کے جانشین ہوئے۔ یہ صغر سنی ہی میں سقوطِ درعیہ کے وقت مصر چلے گئے تھے۔ اپنے والد اور دوسرے اہلِ علم سے تحصیل کی۔ ۱۲۶۴ھ میں نجد واپس آئے اور اپنے ساتھ کتابوں کا بڑا ذخیرہ لائے۔ آتے ہی اپنے والد کے دستِ راست بن گئے اور علمی و تبلیغی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ ۱۲۶۲ھ تک فیصل

---

[1] عنوان: ج: ۲: ص ۲۳-۲۶

[2] عنوان: ج ۱، ص ۲۰۱ یہ ابن بشر کی روایت ہے، مگر ریاض کے موجودہ اصحابِ علم نے اس کی توثیق نہیں کی۔

بن ترکی (ف ۱۲۸۲ھ) کی مجلسوں میں عبدالرحمان بن حسن مدرس اور واعظ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ ۱۲۶۵ھ میں عبداللطیف بن عبدالرحمان قاضی، امام، مدرس بہر حیثیت سے آگے آگے دکھائی دیتے ہیں۔ ابن بشران کے درسِ تفسیر کا بہت مداح ہے[1] پالگریو نے ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ء میں ان سے ملاقات کی تھی۔ اُس وقت ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ پایۂ تخت ریاض کے قاضی تھے[2] ان کی کتاب منہاج التقدیس والتاسیس فی الرد علے المبطل داؤد بن سلیمان بن جرجیس کا ذکر آگے آئے گا۔ ان کا ایک مختصر رسالہ مجموعۃ الہدیۃ السنیۃ۔ (صفحہ ۲۸-۴۰) کے ضمن میں بھی طبع ہو چکا ہے۔ اس میں شیخ الاسلام کی مختصر سیرت بیان کی گئی ہے۔ ۱۲۹۳ھ میں وفات پائی۔

شیخ عبدالرحمان بن حسن کے ایک دوسرے صاحبزادے اسحاق بن عبدالرحمان بن حسن کا ذکر اب تک کسی تذکرہ میں نہیں ملا۔ لیکن ہمیں ان سے واقفیت عجیب دلچسپ طریقے پر ہوئی۔ شوال (۵۹ھ) میں وطن جانا ہوا (اوگانواں ضلع پٹنہ) اور اپنے خاندانی کتاب خانہ کی خستہ حال کتابوں کا جائزہ لینے لگا، تو صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیخ دحلان کا ایک نسخہ ملا، جس کے پہلے ورق پر یہ عبارت خالص عربی خط میں لکھی ملی "فی ملک الحقیر الفقیر اسحٰق بن عبدالرحمٰن بن حسن بن محمد النجدی الحنبلی عفی اللہ عنہم"

میری خوشی کا کیا کہنا! الٹتے پلٹتے پر آخر میں اسی خط میں ایک لمبا نوٹ ملا، جس

---

[1] عنوان ج ۱، صفحہ ۱۱۲، ۲۲۱

[2] پالگریو ج ۱، صفحہ ۲۷۹

سے ان کے علم کا بھی پتہ چلتا ہے۔ درمیان میں بھی ایک مختصر سا نوٹ ہے۔ شروع میں نام کے نیچے مہر بھی ہے۔ صرف اسحاق کا لفظ صاف طور پر پڑھا جاتا ہے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتاب ہمارے ہاں کس طرح پہنچی؟ قرین قیاس یہ ہے کہ عاجز کے نانا مولانا عبدالصمد (ف ۱۳۱۸ھ) سے ان کے تعلقات ہوں گے۔ مولانا عبدالصمد ایک جید اہلِ حدیث عالم تھے اور وقت کے مشہور اہلِ حدیث عالموں سے ان کے تعلقات دوستانہ اور برابری کے تھے۔ تفتیش سے پتہ چلا کہ یہ اسحاق بن عبدالرحمان بن حسن ہندوستان رہے تھے اور مولانا سید نذیر حسین صاحب سورج گڑھی مونگیری دہلوی (ف ۱۳۲۰ھ) نواب صدیق حسن خاں صاحب (ف ۱۳۰۷ھ) اور مولانا محمد بشیر صاحب سہسوانی (ف ۱۳۲۶ھ) اور شیخ حسین بن محسن یمنی (ف ۱۳۲۷ھ) سے استفادہ بھی کیا تھا۔ ۲۸ رجب ۱۳۱۹ھ کو وفات پائی۔

موجودہ عہد میں اس خاندان کے عالموں میں محمد بن عبداللطیف بن عبدالرحمان سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ان کا ایک رسالہ (مؤلفہ ۱۳۳۹ھ) الدرر السنیۃ کے مجموعے میں شامل ہے۔ راقم کے زیارت ریاض سے ایک سال پیشتر وفات پائی (۱۳۶۷ھ)۔

اس وقت بھی شیخ محمد بن عبدالوہاب کی اولاد علم و فضل میں ممتاز ہے اور سعودی حکومت میں ان ہی کا اثر و رسوخ ہے۔ مملکت سعودیہ کے قاضی القضاۃ عبداللہ بن حسن بن حسین بن علی بن حسین بن الشیخؒ (مولود ۱۲۸۳ھ) ان میں سب سے معمر ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی عمر بن حسن (مولود ۱۳۱۹ھ) ہیئۃ الامر بالمعروف والنہی عن المنکر کے رئیس ہیں۔ شیخ عبداللہ بن حسن تو اچھی طرح بات بھی نہیں کر پاتے، مگر شیخ عمر بڑے خوش

مذاق ہیں اور سلطان ابن سعود مرحوم کے ساتھ ایام حج میں آیا کرتے تھے قاضی القضاۃ[1] کا تو صدر مقام ہی مکہ مکرمہ ہے۔ مگر علم و فضل خاندان کی دوسری شاخ میں ہے۔ اس وقت نجد کے سب سے ممتاز عالم اور امورِ شرعیہ میں مرجع آخر، شیخ محمد بن ابراہیم بن عبداللطیف بن عبدالرحمان بن حسن بن الشیخ (مولود ۱۳۱۱ھ) ہیں۔

ان کے دوسرے بھائی عبداللہ بن ابراہیم (مولود ۱۳۰۵ھ)، عبدالملک بن ابراہیم (مولود ۱۳۲۳ھ) اور عبداللطیف بن ابراہیم (مولود ۱۳۱۵ھ) بھی ریاض کے ممتاز علماء سے ہیں۔ ان کے چچا محمد بن عبداللطیف کا ذکر آچکا ہے۔ ان کے والد ابراہیم بن عبداللطیف (ف ۱۳۲۹ھ) بھی ممتاز اور صاحب تصنیف عالم تھے۔

ایک خاص خصوصیت ابن خلدون نے لکھا ہے کہ حسب تین پشتوں سے زیادہ ساتھ نہیں دیتا۔ تاریخ سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ اسلامی ہند کا سب سے بڑا علمی خانوادہ (خاندان ولی اللہی) تین پشتوں پر ختم ہو گیا۔ خیر، یہاں تو نسل ہی منقطع ہو گئی۔ بڑے بڑے علمی و اصلاحی خانوادوں کو لیجئے، دو تین پشتوں کے بعد خصوصیات باقی نہیں رہتیں۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب پر اللہ کا یہ خاص فضل ہوا کہ ان کی اولاد آج تک علم و فضل میں ممتاز چلی آتی ہے۔ شیخ محمد بن ابراہیم بن عبداللطیف بن عبدالرحمان بن حسن بن محمد شیخؒ کی چھٹی پشت میں ہیں اور اس وقت وہی علمائے نجد کے سرتاج

---

[1] راقم کو ان سے تبادلۂ خیال اور مذاکرہ کا خاصا موقع ملا۔ (ملاحظہ ہو "دیار عرب میں") علمائے نجد کی وفیات اور سنین ولادت کی تحقیق بھی انہیں کے ذریعہ ہوئی۔ ملاحظہ ہو دیباچہ۔

ہیں۔ ان کے والد (ابراہیم ف سنہ ۱۳۲۹ھ)، دادا (عبداللطیف ف سنہ ۱۲۹۳ھ) پردادا (عبدالرحمان ف سنہ ۱۲۸۵ھ) سب کے سب اپنے دور کے مشاہیر اہل علم میں تھے۔ یہ اللہ تعالےٰ کا فضل ہے، جسے چاہے نواز دے۔

دوسرا باب

(۲)

سیاسی برتری

شیخ کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد نجد اور اطراف نجد میں جو خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں، وہ سب ثمرہ تھیں شیخ الاسلام کی دعوت' اور ان کے اخلاص کا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ نے اہل نجد کی زندگی، عقائد اور اخلاق میں ایک غیرمعمولی انقلاب نہیں، بلکہ کایا پلٹ کر دی۔ خوش قسمتی سے انھیں محمد بن سعود (ف ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء) عبدالعزیز بن محمد بن سعود (۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء - ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) اور سعود بن عبدالعزیز (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء - ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) جیسے اولوالعزم مجاہد اور فرماں روا ملے، جنھوں نے شیخ کے مشن کی تکمیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

شیخ کی دعوت کے ساتھ ساتھ آل سعود کا نام بھی وابستہ ہو گیا ہے، اس لئے ہم مختصر طور پر آل سعود کی تاریخ کے ان اہم حصوں کو پیش کر دینا چاہتے ہیں، جن کا اس تحریک سے خاص اور بلاواسطہ تعلق ہے۔

محمد بن سعود[1] | امیر محمد بن سعود (ف ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵ء) نے دعوت کے پھولتے پھلتے ہی حرمین کو ایک وفد بھیجا، جس نے شریف مسعود بن سعید (۱۱۴۶ھ / ۱۷۳۳ء – ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء) سے حج کی عام اجازت طلب کی اور علمائے حرمین سے مختلف فیہ مسائل پر گفتگو کی۔ "مفتیان حرم" کا رویہ افسوسناک رہا اور وفد کے اراکین گرفتار کر لئے گئے۔ بعضوں نے مشکل سے اپنی جان چھڑائی۔

امتناعِ حج | یہ دحلان کا بیان ہے،[2] جس کی دونوں کتابوں (خلاصۃ الکلام فی امراء البلد الحرام اور الدرر السنیۃ فی الرد علی الوہابیۃ) میں نہ تاریخیں صحیح درج ہیں نہ واقعات کی تدوین میں دیانت داری سے کام لیا گیا ہے۔ دحلان نے سال کی تعیین بھی نہیں کی۔ بہرحال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے پہلے اہل نجد کے خلاف امتناع حج کے احکام صادر ہو چکے تھے۔ ابن بشر، ۱۱۶۲ھ کے واقعات میں صرف اس قدر ذکر

---

[1] نجد کی سیاسی تاریخ ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ ہم صرف ان گوشوں کو اجاگر کر رہے ہیں جن کا شیخ کی سرگرمیوں سے خاص تعلق تھا۔ نجد اور آل سعود کی تفصیلی تاریخ کے لئے ملاحظہ ہو:

(۱) عنوان المجد (ابن بشر)۔

(۲) عجائب الآثار (جبرتی)، جلد ۳ و ۴۔

(۳) تاریخ نجد (آلوسی) ص ۱۰۴ – ۹۰

(۴) حاضر العالم الاسلامی جلد ۴ ص ۱۶۲ – ۱۹۱ (امیر شکیب ارسلان)۔

(۵) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (مقالہ: ابن سعود)

(۶) Arabia (از فلبی) جو بہت مفصل اور کافی سے زیادہ ہے۔ ایمن ریحانی کی کتابیں بھی عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں مشہور اور مقبول ہیں۔ مآخذ کے سلسلے میں ان کے علاوہ اور دوسری کتابوں کا ذکر آئے گا۔

[2] الدرر السنیۃ: ص ۴۴

کرتا ہے[١]:-

"١١٦٢ھ میں مسعود بن سعید شریف مکہ نے نجدی حاجیوں کو قید کر لیا اور ان میں سے کچھ مر گئے۔"

یہ شیخ الاسلام کی دعوت کا ظہور ١١٥٧ھ کے بعد ہوا، اور شہرت و مقبولیت ١١٦٠ھ کے بعد شروع ہوئی۔ اس لئے یہ قرین قیاس نہیں کہ ١١٦٢ھ سے پہلے نجد کے حجاج بیت الحرام کی زیارت سے روکے گئے ہوں۔ یہ قرائن بتاتے ہیں کہ حاجیوں کی گرفتاری کے اسی واقعہ سے امتناع حج کا آغاز ہوا۔ اور درمیانی وقفوں کے ساتھ یہ پابندی اہل نجد پر برابر عائد رہی۔ ١١٩٧ھ، ١١٨٥ھ، ١١٨٣ھ میں خاص طور پر اجازت ملی اور نجد کے عالم و عامی بڑی تعداد میں زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ لیکن یہ "اجازتیں" اتفاقی تھیں۔ سعود بن عبدالعزیز کے داخلہ حرم سے پہلے اہل نجد کو کبھی بلا روک ٹوک حج و زیارت کا موقع نہ ملا[٢]۔ تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو:-

(الف) امیر محمد بن سعود کی وفات عین دعوت کے شباب میں | عبدالعزیز[٣] بن محمد بن سعود۔

---

١ عنوان المجد: جلد ١ صفحہ ٢٣ ۔ ٢ سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود کو ١٢١٨ھ/١٨٠٣ء میں فاتح کی حیثیت سے مکہ مکرمہ کی زیارت نصیب ہوئی۔

٣ بعض لکھنے والے عبدالعزیز بن محمد بن سعود کو شیخ الاسلام کا نواسہ بتاتے ہیں (دہلی: صفحہ ٤١-٤٢، ڈکشنری آف اسلام: صفحہ ٦٦٠)۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ اس سلسلہ میں بڑی غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ براؤنج (صفحہ ١٠٠) بھی اسی طرح کی بے سر و پا باتیں لکھتا ہے۔ معاصر مورخوں نے آل الشیخ اور آل سعود کی مصاہرت کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ راقم نے ریاض میں شیخ کے اہل خاندان سے تحقیق کی۔ ان کے نزدیک بھی یہ بالکل من گھڑت افسانہ ہے۔

ہوئی[1] عبدالعزیز بن محمد بن سعود جانشین ہوا۔ مارگولیوتھ کے بیان کے مطابق ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۶ء میں ایک وفد مکہ گیا۔ جہاں اُن کی خاطر مدارات ہوئی۔ شریف نے میزبانی کی اور وفد نے علماء کو یقین دلایا کہ ان کے عقائد (امام اہل سنت) احمد بن محمد بن حنبل کے عقائد سے الگ نہیں۔

یہ مارگولیوتھ کا بیان ہے۔ ابن غنام، ابن بشر اور فلبی ۱۱۷۹ھ میں کسی وفد کا ذکر نہیں کرتے۔ پتہ نہیں اس کا ماخذ کیا ہے۔ ابن غنام اور ابن بشر کے سکوت کے بعد مارگولیوتھ کے بیان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ احمد زینی دحلان (الدرر السنیہ ص۴۴) کے بیانات بھی اس سلسلہ میں حد درجہ متعارض اور ناقابل وثوق ہیں

۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء اقتناع کے بعد پہلا حج

۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء میں اشراف حجاز کے ایک دستہ سے کہیں موحدین کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ شریف منصور دستہ کا سردار گرفتار ہوا۔ امیر عبدالعزیز نے اسے بلا فدیہ کے رہا کر دیا، جس کا اچھا اثر پڑا اور معاوضے میں شریف مکہ[2] نے حج

---

[1] ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء۔

[2] انگریز اور یورپی مورخ، مکہ کے حاکم کو Grand Sherif اور خاندان کے دوسرے افراد کو صرف "شریف" کہتے ہیں۔ عربی میں یوں تو "شریف" کا لفظ عام حسنی سادات کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے، مگر شریف مکہ کا لفظ مکہ کے حاکم ہی کے لئے بولا جاتا ہے۔ اشراف کی تاریخ کے لئے دحلان کی کتاب خلاصۃ الکلام فی امراء البلد الحرام ملاحظہ کی جا سکتی ہے، گو زیادہ قابلِ اعتماد نہیں۔ محمد لبیب البتنونی کی الرحلۃ الحجازیۃ (۱۳۲۹ھ) میں بھی اشرافِ مکہ کی مختصر تاریخ دی گئی ہے۔ Bruck Hardt کی Travels in Arabia (جلد ۱، صفحہ ۲۰۲-۲۰۵) میں بھی مکہ کی حکومت پر ایک پر از معلومات باب ہے۔ ہوگارتھ کی A History of Arabia

کی اجازت دی اور موحدین کی ایک کافی تعداد نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

"..... فاغتنم ذلك من المسلمين طائفة وسارت للحج آمنة"[1]

یہ اجازت بہر حال اسی سال تک محدود رہی، البتہ اس سے آئندہ گفت و شنید اور بحث و تمحیص کا دروازہ کھل گیا۔

پہلا نجدی وفد ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء ۱۱۸۵ھ میں شیخ اور عبدالعزیز نے احمد بن سعید (۱۱۸۴ھ - ۱۱۸۶ھ) والیٔ مکہ کو ہدیے بھیجے۔ اس نے خط و کتابت کے ذریعہ ان (شیخ اور امیر عبدالعزیز) سے ایک عالم و فقیہ کے بھیجنے کی فرمائش کی تھی جس سے علماء مکہ ان کی دعوت اور مسلک پر گفتگو کر سکیں۔ تو شیخ اور عبدالعزیز نے شیخ عبدالعزیز بن الحصین کو ایک خط دے کر بھیجا جس کا مضمون یہ تھا.........

جن علماء (مکہ) نے ان سے گفتگو کی، ان کے نام یہ ہیں: یحییٰ بن صالح الحنفی، عبدالوہاب بن حسن الترکی (سلطان کے مقرر کردہ مفتی) اور عبدالغنی بن ہلال۔

(بقیہ حاشیہ ص۶۷) میں بھی "اشراف مکہ" پر ایک باب ہے، مگر مختصر۔ ہماری تحریک کا تعلق جن اشراف سے رہا، ان کے نام اور سنین تولیت یہ ہیں:

(۱) مسعود بن سعید (۱۱۴۶ھ) (۲) مساعد بن سعید (۱۱۶۵ھ) (۳) جعفر بن سعید (۱۱۷۲ھ) (۴) مساعد بن سعید (۱۱۷۳ھ) (۵) عبداللہ بن سعید (۱۱۸۴ھ) (۶) احمد بن سعید (۱۱۸۴ھ) (۷) عبداللہ بن حسن (۱۱۸۴ھ) (۸) احمد بن سعید (۱۱۸۴ھ) (۹) سرور بن مساعد (۱۱۸۶ھ) (۱۰) عبدالمعین بن مساعد (۱۲۰۲ھ) (۱۱) غالب بن مساعد (۱۲۰۲ھ) (۱۲) یحییٰ بن سرور (۱۲۲۸ھ) الخ۔

[1] روضۃ الافکار، ج ۲، ص ۹۱۔

تین مسئلوں (۱ تکفیر، ۲ ہدمِ قباب، ۳ بزرگوں سے مرادیں مانگنا) پر وہ شیخ عبدالعزیز کی دلیلوں سے مطمئن ہو گئے اور شیخ عبدالعزیز اعزاز و توقیر کے ساتھ واپس کیے گئے[1]۔

ابن بشر[2] نے اس وفد کا صرف سرسری تذکرہ کیا ہے، فلبی[3] نے اس وفد کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس کا ماخذ غالباً ابنِ غنام کی روضۃ الافکار ہی ہے لیکن اس نے ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء کے حج اور ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء کے وفد کو خلط ملط کر دیا ہے۔ حالانکہ ابن غنام نے دونوں واقعے الگ الگ ذکر کئے ہیں۔

وفد کے سرگروہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن الحصین کا شمار شیخ الاسلام کے مخصوص شاگردوں میں تھا۔ شیخ کو خود ان پر بڑا اعتماد تھا۔ شیخ نے اپنی زندگی میں انہیں دو بار رئیس وفد بنا کر مکہ مکرمہ بھیجا۔ شیخ کے بعد امیر عبدالعزیز (ف ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) سعود بن عبدالعزیز (ف ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) اور عبداللہ بن سعود (مصلوب ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء) تینوں کے عہد حکومت میں منصب قضاء پر فائز رہے۔ سقوط درعیہ کے وقت (۱۲۳۳ھ) جب کہ یہ بہت ضعیف ہو چکے تھے، ابراہیم پاشا ان کے ساتھ بری طرح پیش آیا اور سخت کلامی بھی کی[4]۔ فتح اور دنیوی سربلندی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ غنیمت ہے کہ اوروں کی طرح انہیں پھانسی نہیں دی گئی۔ ۱۲ رجب ۱۲۳۷ھ (۴ اپریل ۱۸۲۲ء) کو وفات پائی[5]۔

---

[1] روضۃ الافکار ج ۲ ص ۹۱-۹۲ ؛ [2] ایضاً ج ۱ ص ۵۹ ؛ [3] ص ۲۳-۲۴

[4] عنوان ج ۱ ص ۱۹۱ ؛ [5] مزید حالات اور شاگردوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: عنوان المجد: ج ۱ ص ۹۴، ۱۹۱، ۲۳۴، ۲۳۳ ؛

قحط سالی اور حج کی عام اجازت
۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۵ء

"۱۱۹۷ھ میں عبدالعزیز (رحمہ اللہ تعالیٰ) نے سرور والیٔ مکہ مشرفہ کو گھوڑے سواریاں اور مختلف چیزیں ہدیہ بھیجیں۔ اس تمام تعظیم و تکریم اور ہدایا سے اصل غرض، اہلِ دین و اسلام (یعنی اہلِ نجد، اتباعِ شیخ الاسلام مدظلہ العالی) کے لئے ادائے فرض (التزام الرکن الخامس) کی عام اجازت حاصل کرنا تھی، جس سے وہ سالہا سال سے روک دیئے گئے تھے۔ اور جس کی بجا آوری کے لئے ان کے دل تڑپ رہے تھے۔۔۔ تو اس سال سبھوں نے حج کیا، کوئی تین سو آدمی ہوں گے۔"[1]

ابن بشر نے اس کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ فلبی نے "اجازت" اور اس کے اسباب نتائج پر مفصل گفتگو کی ہے۔ ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۵ء کی قحط سالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"...... تاہم (یعنی امیر عبدالعزیز کی تمام کوششوں کے باوجود) اس قحط سالی سے جو دو سال تک رہی پورے عرب کو کافی نقصان پہنچا۔ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ جب شریفِ اعظم سرور نے وہابی حاکم کو اس پابندی کے اٹھائے جانے کی اطلاع دی۔"[2]

---

[1] روضۃ الافکار، ج ۲، ص ۱۳۲۔

[2] فلبی (ص ۳۸) کے بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ شریف سرور (۱۱۸۶ھ - ۱۲۰۲ھ) نے از خود اجازت دی تھی، حالانکہ ابن غنام کے مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر عبدالعزیز کی سلسلہ جنبانی پر یہ اجازت ملی تھی:- وقصدہ بذلک التشریف والاکرام واھدائہ...... الرخصۃ لاھل الدین والاسلام فی اداء واجب الافتراض...... الخ

جو ان کے آزادانہ حج پر چند سال پہلے عائد کر دی گئی تھی، تو قحط سالی کے سبب سے صرف تین سو آدمی فائدہ اٹھا سکے۔ وہابیوں کو حج کی دوبارہ اجازت اس دور کی عربی تاریخ میں خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ سرور، عملاً قسطنطنیہ کے برائے نام (Titular) خلیفہ کے اقتدار سے بالکل آزاد ہو چکا تھا، اور اب اس نے عسیر اور نجد کے حدود کی طرف تاخت شروع کر دی تھی۔ وہابیوں کے خلاف امتناع حج کا حکم بھی اس نے اپنی برتری منوانے کا ایک ذریعہ بنانا چاہا تھا۔ لیکن وہابیوں نے اس کی برتری تسلیم نہیں کی۔ اور امتناع حج کا بدلہ انھوں نے یہ لیا، کہ عراق و فارس کے حاجیوں کے قافلے جو وہابی علاقے سے گزرتے تھے، نجدی دستوں کی چھیڑ چھاڑ کا شکار ہونے لگے۔ یہ شریف سرور کی طاقت سے باہر تھا کہ ان قافلوں کی حفاظت کا ذمہ لے سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ بغداد کے ترکی پاشا نے قافلوں کی روانگی روک دی۔ اس لئے کہ فارس کی حکومت صحرا کی تکلیفوں کا الزام پاشائے بغداد ہی پر ڈالتی تھی۔ اُن دنوں حجاز کا سارا دار و مدار انہیں قافلوں پر تھا، جو خشکی کے ذریعہ حج کو آتے تھے۔ مکہ اور مدینہ کے تاجروں نے تنگ آ کر شریف کو نجدی حکومت سے تعلقات استوار کرنے پر مجبور کیا سرور کے لئے جھکنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ اور گھوڑوں اور اونٹوں کا تحفہ جو وہابی حاکم نے قحط سالی کے سال شریف کو بھیجا۔ اس سے دونوں حکومتوں کے تعلقات کی شگفتگی سب لوگوں پر ظاہر ہو گئی۔ ...... الخ -

لیکن یہ بات بھی عارضی ثابت ہوئی[1]

دوسرا نجدی وفد سنہ ۱۲۰۴ھ

شریف سرور کا انتقال سنہ ۱۲۰۲ھ میں ہوا۔ اس کے بعد حمید المعین بن مساعد والی ہوا۔ پھر غالب بن مساعد امیر مقرر ہوا۔ یہی شریف غالب ہے جس کے عہد میں اہل نجد اور حجازیوں اور مصریوں کے درمیان معرکہ آرائیاں ہوئیں مورخوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کش مکش سے بچنا چاہتا تھا۔ لیکن علماء نے صلح نہ ہونے دی۔

واقعہ کچھ بھی ہو۔ شریف غالب (سنہ ۱۲۰۲ھ۔ سنہ ۱۲۲۳ھ) کی معاملہ فہمی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے کچھ ہی بعد (دو برس بعد) امیر عبد العزیز سے ایک ایسے عالم کی فرمائش کی جو شیخ الاسلام کی دعوت پر گفتگو کر سکے۔ امیر عبد العزیز نے خوشی خوشی دعوت قبول کی اور شیخ عبد العزیز بن الحصین کو (جو پہلے وفد کے رئیس بنا کر بھیجے گئے تھے) اس خدمت پر مامور کیا۔ خود شیخ الاسلام نے اپنے دست خاص سے لکھ کر ایک خط دیا۔ جس میں پہلے وفد کے حوالے کے ساتھ، وہ دلیلیں تفصیل سے بیان کی گئیں۔ جن سے اُس وقت علمائے مکہ مطمئن ہو گئے تھے۔ غالب نے شیخ عبد العزیز بن الحصین کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ دیر تک گفتگو کی اور ان

---

[1] Arabia: ص ۳۸-۳۹ Mordtmann (مقالہ ابن سعود انس اسلام کے بیان کے مطابق سرور کی دی ہوئی اجازت غالب نے سنہ ۱۲۰۲ھ میں چھین لی۔ عام طور پر مورخ لکھتے ہیں کہ اجازتیں عارضی تھیں اور اہل نجد پر حج کے سلسلہ میں امتناعی احکام جاری رہے تا آنکہ سنہ ۱۲۰۵ھ سے باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ (الرحلۃ الحجازیۃ ص ۹۸)

کے دلائل کی اہمیت اور سچائی تسلیم کی۔ لیکن مقامی علماء کے بہکانے سے وہ اپنے خیال سے پھر گیا۔ "فقیہانِ حرم" نے اسے یہ سوجھایا کہ "تم نے ابن سعود کی اطاعت قبول کی، تو شریفی امارت پر ابن سعود کا قبضہ ہو جائے گا۔" بات لگتی ہوئی تھی، غالب کے دل میں اتر گئی اور نجدی اقتدار کے ہوّے نے اسے قبولِ حق سے باز رکھا، جس کا خمیازہ تمام دنیائے اسلام کو بھگتنا پڑا۔ شیخ عبدالعزیز نے اصرار بھی کیا کہ مقامی علماء کی ایک مجلس ترتیب دی جائے اور مختلف فیہ مسئلوں پر کھل کر گفتگو کی جائے لیکن مقامی علما اس پر راضی نہ ہوئے اور انہوں نے صاف صاف اعلان کیا:۔

"ان وہابیوں کے ساتھ کوئی گفت و شنید بے کار ہے، کہ ان کے عقائد ہمارے اسلاف کے عقائد کے بالکل برعکس ہیں۔"

اگر فقیہانِ حرم کا رویہ نا عاقبت اندیشانہ نہ ہوتا، اور شریف غالب اور امیر عبدالعزیز کے درمیان مفاہمت ہو جاتی۔ تو مسلمانوں کا کتنا قیمتی خون ضائع ہونے سے بچ جاتا؟[۱]

تعجب ہے کہ ابن بشر نے اس قدر اہم واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔

تیسرا نجدی وفد **۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۷ء** دوسرے وفد کی ناکامی کے بعد طرفین میں چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۱ء میں خود غالب نے پہل کی۔ یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ درمیان میں صلح بھی ہوتی رہی۔ اس اثناء میں نجدی فوجیں جزیرۃ العرب کے باقی علاقوں میں اپنا اثر و نفوذ بڑھاتی رہیں، تا آنکہ ۱۲۱۱ھ میں انہوں نے احساء کے پاس جزیرہ عمائر پر حملہ کیا اور کامیاب لوٹے۔[۲] نجدی طاقت کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر

---

[۱] روضۃ الافکار: ج ۲، ص ۱۶۲-۱۶۳۔ [۲] عنوان المجد ج ۱، ص ۱۱۰۔

شریف غالب نے ایک مرتبہ پھر سلسلہ جنبانی کی۔ امیر عبدالعزیز کو ایک خط بھیجا اور ایک ایسے نجدی عالم کے بھیجنے کی درخواست کی۔ جو موحدین کا مسلک اہلِ مکہ کے سامنے پیش کر سکے۔ پہلے دو نوں وفد شیخ الاسلام کی زندگی میں اور ان کی ہدایتوں کا نوشتہ ساتھ لے کر گئے تھے۔ تیسرے وفد کا مطالبہ ان کے انتقال ۱۲۰۶ھ کے بعد ہوا۔ تاہم امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود نے فوراً دعوت قبول کر لی۔ اس لئے کہ اسے تبلیغ سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں تھی۔ شیخ الاسلام کے ایک ممتاز شاگرد شیخ احمد بن ناصر بن عثمان بن معمر اس خدمت پر مامور ہوئے۔ احمد بن ناصر اور ان کے ساتھی پہلے طواف سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد امیر عبدالعزیز کے تحفے شریف کی خدمت میں پیش کئے۔ ان کا استقبال نہایت دوستانہ ہوا اور مسلسل کئی دنوں تک مقامی علماء سے گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں شیخ احمد بن ناصر کی خدمت میں کچھ سوالات پیش ہوئے اور تحریری جواب کا مطالبہ کیا گیا۔ شیخ احمد بن ناصر نے مفصل اور مدلل تحریری جواب دیا جو ایک رسالے کی صورت میں "الفواکہ العذاب فی الرد علی من لم یحکم السنۃ والکتاب" کے نام سے چھپ گیا ہے[1] اس رسالے میں خاص طور پر دو مسئلوں سے بحث کی گئی ہے:۔

(۱) شفاعت اور استغاثہ۔

(۲) تارکین صلاۃ کی تکفیر اور ان سے قتال

---

[1] مجموعۃ الہدیۃ السنیۃ، ص ۹۰ - ۵۵

(آگے چل کر ان مسئلوں پر تفصیلی گفتگو ہو گی، اس لئے یہاں اس رسالہ کے موضوعِ بحث، کو چھیڑنا مناسب نہیں۔)

یہ مناظرہ جب ۱۲۱۱ھ میں غالب کے سامنے بھری مجلس میں ہوا تھا ابنِ غنام ۱۲۱۱ھ کے حوادث، کے ضمن میں لکھتا ہے:۔

"وہ (علمائے مکہ مکرمہ) شیخ احمد بن ناصر کی دلیلوں کی قوت تسلیم کرنے کے باوجود قبولِ حق پر آمادہ نہ ہوئے:

"انھم اعترفوا باستقامۃ بحجہ ومع ذالک جحدوا" الخ

ابن غنام نے پورا رسالہ بھی نقل کر دیا ہے[1] فلبی[2] نے بھی اس وفد اور مناظرہ کی پوری روداد درج کی ہے۔ تعجب ہے کہ ابن بشر نے اس وفد کا بھی مطلق ذکر نہیں کیا۔

وفد کے رئیس شیخ احمد بن ناصر بن معمر کے متعلق بھی دو حرف لکھنا نامناسب نہ ہوگا۔ پہلے اور دوسرے وفد کے رئیس شیخ عبدالعزیز الحصین (ف ۱۲۳۷ھ) کی طرح یہ بھی شیخ الاسلام کی شاگردی کا شرف رکھتے تھے۔ شیخ الاسلام کے علاوہ، ان کے بھائی سلیمان بن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۸ھ) اور ان کے شاگرد و سیرت نگار ابن غنام (ف ۱۲۲۵ھ) سے بھی مستفید ہوئے تھے۔ درعیہ میں عرصہ تک عہدۂ قضا پر مامور رہے۔ امیر سعود بن عبدالعزیز (۱۲۱۸ – ۱۲۲۹) نے انھیں درس و افتاء کے لئے مکہ مکرمہ بھیجا تھا، اور وہیں وفات پائی[3] (وسط ذی الحجہ ۱۲۲۵ھ، آغاز جنوری ۱۸۱۱ء)

---

[1] روضۃ الافکار ج ۲ ص ۲۲۶ – ۲۶۱ ؛ [2] Arabia ص ۷۱ ؛ [3] عنوان المجد ج ۱ ص ۱۵۲

جنگ کے بعد صلح: سنہ ۱۲۱۳ھ

اب نجدی وہابیوں کی کامیابیاں اتنی بڑھیں کہ بابِ عالی[1] کو بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ سلیمان پاشا، والیِ بغداد کے ذمہ یہ مہم کی گئی۔ سلیمان نے ثوینی اور علی پاشا کی سرکردگی میں بالترتیب فوجیں بھیجیں[2]، جو ناکام واپس آئیں۔ پھر کیا تھا، نجدی فوجیں عراق کی سرحد پر مسلسل دھاوے کرنے لگیں۔ امیر عبدالعزیز نے بڑھ کر بحرین اور سواحلِ عمان پر قبضہ کر لیا، جو بصرہ اور بغداد کے ترک حاکموں کے حملوں کے باوجود مستحکم ہوتا گیا۔

نجدیوں پر امتناعِ حج کی پابندی اور بدلے میں ان کا عراق پر حملہ اور عراقی قافلے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا اشرافِ مکہ کے لئے ہمیشہ خلجان کا باعث رہا۔ اور اسی دباؤ سے مجبور ہو کر انھوں نے بارہا حج کی عارضی اجازت دی اور وفود طلب کئے، پھر فوج کشی کی ٹھانی۔ غالب کا یہ رویہ برابر قائم رہا، اور اس نے ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء، ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء اور ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء میں مسلسل تیاریوں کے بعد حملے کئے اور ہمیشہ ناکام رہا[3]۔ آخری

---

[1] ۱۲۱۱ھ میں غالب نے خاص طور پر آستانۂ خلافت کو وہابیوں کی "سرکوبی" کی طرف توجہ دلائی، لیکن سرکارِ عالی نے کسی سرگرمی کا اظہار نہیں کیا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے سلیمان پاشا، بغداد کا حاکم، اہلِ نجد کے مقابلہ میں فوج کشی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اس کے بعد ۱۲۱۳ھ میں تو خود دحلان کے بیان کے مطابق سلیمان کے نائب علی پاشا نے ایسی چڑھائی کی تھی کہ "اگر ان کی زندگی باقی رہتی، تو وہابیوں کا یقینی خاتمہ ہو گیا تھا" (خلاصۃ الکلام: ص ۲۶۸-۲۶۶)

[2] ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء اور ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عنوان المجد ج ۱، ص ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۰۸؛ فلبی ص ۶۸-۷۰

[3] عنوان المجد ج ۱: ص ۸۰، ۸۶، ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۱۲، ۱۱۳؛ فلبی: ص ۵۳، ۵۱، ۶۴، ۷۳، ۷۴

سخت معرکہ ۱۲۱۲ھ[1] میں پیش آیا۔ اور غالب کو خرمہ (تربہ کے قریب ایک مشہور گاؤں) کے مقام پر بہ بھی شکست ہوئی اور اس کے بہ(ا)دروں آدمی کام آئے تو اس کے لئے صلح جوئی اور حج کی اجازت دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ دونوں علاقوں کے درمیان حد بندی کر دی گئی۔ عتیبہ، حرب اور عسیر کا شمالی علاقہ شریف کے حدود مملکت میں رہا۔ یہ صلح آخر جمادی الاولی ۱۲۱۲ھ دسمبر ۱۷۹۸ء میں ہوئی[2] - اور ۱۲۱۳ھ سے ۱۲۱۵ھ تک نجدی حجاج، اور ان کے ساتھ عراقی قافلے، امن و امان کے ساتھ فریضہ حج ادا کرتے رہے۔

حج ۱۲۱۳ھ | "خرمہ کے واقعہ کے بعد شریف نے عبدالعزیز کے پاس قاصد بھیجا اور صلح کی خواہش کی جسے امیر نے قبول کیا اور شریف نے اہل نجد کو حج کی اجازت دی۔

اس سال نجد کا ایک قافلہ حج سے مشرف ہوا جس میں شیخ الاسلام کے دو فرزند علی بن محمد اور ابراہیم بن محمد بھی تھے[3]۔ دونوں کے درمیان عہد و پیمان مکمل ہو گئے۔ جنگ کی موقوفی اور امن و امان کا اعلان کر دیا گیا۔ وہابیوں کو حج بیت اللہ کی اجازت ملی۔ اور لوگوں کو ان کے ساتھ کسی قسم کا تعرض کرنے سے روک دیا گیا۔ تو ہر طرف سے وہ مکہ کی طرف لپکے۔ اللہ تعالیٰ کی بھی عجب

---

[1] یہ معرکہ جو وقعۃ الخرمۃ کے نام سے مشہور ہے، شوال ۱۲۱۲ھ (مارچ اور اپریل ۱۷۹۸ء) میں پیش آیا۔ غالب شکست کھا کر ۳ ذی القعدہ ۱۹ اپریل ۱۷۹۸ء کو مکہ واپس ہوا (خلاصۃ الکلام ص ۲۶۷)

[2] خلاصۃ الکلام ص ۲۶۷ [3] عنوان ج ۱ ص ۱۲۰

شان ہے[1] (!!)

احمد دحلان، حمد بن ناصر کے حج کا بھی ذکر کرتا ہے، لیکن ابن بشر، دوسرے اعیان کے ضمن میں ان کا نام نہیں لیتا۔

اس سال خود امیر عبدالعزیز یا سعود بن عبدالعزیز حج سے مشرف نہ ہو سکے سلیمان پاشا نے اپنے نائب علی پاشا کی سرکردگی میں عظیم الشان فوج ان کے مقابلہ کے لئے بھیجی تھی۔ اس مہم کی تیاریوں میں دونوں باپ بیٹے الجھے رہے، یہ رمضان ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ ۱۷۹۹ء کا ذکر ہے۔

حج ۱۲۱۴ھ | "اس سال سعود بن عبدالعزیز پہلی مرتبہ حج سے مشرف ہوا۔ اہل نجد جنوب الاحساء، اور بدوؤں کی ایک بڑی تعداد وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

یہ حج بہت شاندار طریقہ پر ادا ہوا۔ نہایت اچھی طرح عمرہ ادا کیا اور حج سے فارغ ہوئے۔ کوئی تکلیف نہیں پہنچی اور امن و امان سے واپس آئے۔ وللہ الحمد والمنۃ"[2]

اور ۱۲۱۴ھ میں سعود بن عبدالعزیز نے حج کیا۔ اس کے ساتھ بے شمار آدمی تھے (قوم کثیر لا یحصون عددھم ...) مولانا شریف اور وہ ایک خیمہ میں ملے، جو ان کے لئے ابطح میں نصب کیا گیا تھا۔ ۲۸، ذی الحجہ مئی ۱۸۰۰ء کو واپس ہوا[3]

حج ۱۲۱۵ھ | اس سال عبدالعزیز بن محمد بن سعود نے خود زیارت بیت اللہ کا قصد

---

[1] خلاصۃ الکلام، ص ۲۶۸۔ [2] عنوان المجد ج ۱ ص ۱۲۰۔

[3] خلاصۃ الکلام ص ۲۶۸۔

کیا تھا۔ اور اہل نجد و اطراف نجد کی بڑی تعداد لے کر وہ روانہ ہوئے لیکن سات دن برابر سفر کے بعد وہ بچور ہو گئے اور سعود بن عبدالعزیز کے اصرار پر وہ لوٹ گئے اور امیر سعود بن عبدالعزیز نے تزک و احتشام کے ساتھ حج کیا۔ ہزار دینار صدقات اور بخشش کے طور پر تقسیم کئے۔ یہ ان کا دوسرا حج تھا[1]

ان دونوں سالوں میں حج کے قافلے نجد کے حدود سے ہو کر امن و امان سے گزرے۔ خود سعود بن عبدالعزیز نے بہ نفس نفیس نگرانی کی، دوسرے سال عمان کا فرماں روا بھی حج سے مشرف ہوا[2]۔

۱۲۱۲ھ سے ۱۲۱۵ھ تک واقعات اور حج کی یہ ترتیب مستند مآخذ سے لی گئی ہے۔ امیر شکیب کے بیان[3] میں غالباً کسی یورپی ماخذ پر اعتماد کے باعث ترتیب الجھ گئی ہے۔ اور صلح و حج کے سنین کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح مار و نمان کے مقالے[4] میں گو سنین ٹھیک ہیں، لیکن ترتیب اُلٹی پلٹی ہے۔

کربلا پر حملہ ۱۲۱۶ھ، ۱۸۰۲ء نجدیوں کے حملۂ کربلا و نجف اور بلد الحسین کی بے حرمتی کی داستان بہت کچھ رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ہم یہاں صحیح ترین واقعات مختصر طور پر درج کرتے ہیں:۔

"حجاج کے قافلوں پر واپسی میں عراق کے قبیلوں نے حملہ کیا، جنہیں یقینی طور پر اوپر سے اس کی ہدایت تھی، تاکہ وہابیوں کے قافلہ کے انتظام اور ان کی ذمہ داری پر حرف لگایا جا سکے ... لیکن وہابیوں کے تعلقات بغداد اور اشراف

---

[1] عنوان المجد ص ۱۲۱ ؛ [2] فلبی ص ۸۱ ؛ [3] حاضر العالم الاسلامی جلد ۴ ص ۱۶۳ - ۱۶۲ ؛
[4] مقالہ ابن سعود مندرجہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ؛

کے ساتھ زیادہ دنوں تک دوستانہ نہ رہ سکے۔ سعود بن عبد العزیز نے شہر کربلا پر ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۱۶ھ (۲۱ اپریل ۱۸۰۲ء) کو حملہ کیا۔ تاکہ شیعی قبیلہ خزائل کے وہابی قافلہ پر حملہ کا انتقام لیا جائے۔۔۔[1]"

(مارو تمان)

اور اس سال (۱۲۱۶ھ) سعود تمام نجد، جنوب، حجاز اور تہامہ سے ایک جرار لشکر لے کر کربلا کے ارادہ سے چلا اور بلد الحسین کے باشندوں پر حملہ کیا۔ یہ ذی القعدہ کا واقعہ ہے[2] مسلمانوں نے اس پر دھاوا بول دیا۔ اس کی دیواروں پر چڑھ گئے، اور زبردستی (عنوۃً) داخل ہو گئے اور اکثر باشندوں کو گھروں اور بازاروں میں تہ تیغ کر دیا۔ اور اس قبہ کو جو ان کے اعتقاد کے مطابق حسین (رضی اللہ عنہ) کی قبر پر بنایا گیا تھا، ہدم کر دیا۔ قبہ اور اس کے آس پاس اور چڑھاوے (النصیبۃ التی وضعھا علی القبر) کی تمام چیزیں لے لیں قبہ۔ زمرد، یاقوت اور جواہر سے آراستہ تھا، اور اس کے علاوہ شہر میں جو کچھ مال و متاع (ہتھیار، لباس، سونا، چاندی، قیمتی مصاحف اور بے شمار چیزیں) ملا سب لے لیا اور شہر میں ایک پہر سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ (ولم یلبثوا فیھا الا ضحوۃً) اور ظہر کے وقت تمام مال لے کر

---

[1] نلیی: ص۸۹، مارو تمان کا مقالہ۔

[2] ذی القعدہ ۱۲۱۶ھ (مارچ ۱۸۰۲ء) غالباً روانگی کی تاریخ ہے، اصل میں ہے: وفیھا سار سعود بالجیوش۔ وذلک فی ذی القعدۃ" مارو تمان نے حملہ کی صحیح تاریخ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۱۶ھ (۲۱ اپریل ۱۸۰۲ء) دی ہے، جو صحیح معلوم ہوتی ہے۔

وہاں سے نکل آئے اور اس کے باشندوں میں سے تقریباً دو ہزار آدمی قتل کئے گئے[1]

اس واقعہ سے اہلِ نجد کی کتنی ہی تسکین کیوں نہ ہوئی ہو، لیکن عام مسلمانوں خاص کر ایران کے شیعوں میں اس سے بڑی برہمی پھیلی۔ کہا جاتا ہے کہ "فتح علی شاہ قاچار (۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء - ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء) نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ نجد پر فوج کشی کرنا چاہی تھی، اور سلیمان پاشا حاکمِ بغداد بھی ایک بڑی فوج تیار کر رہا تھا، لیکن اہلِ ایران کی روس سے چھڑ گئی اور سلیمان، کردوں کی ایک بغاوت فرو کرنے میں اُلجھ گیا، اس لئے ان کے ارادے پورے نہ ہو سکے"[2]

فتح علی شاہ قاچار، شاہ ایران کی برہمی تو بالکل قرینِ قیاس ہے لیکن نجد پر فوج کشی کے ارادے کی تصدیق دوسری تاریخوں سے نہیں ہوتی۔ مشرقی کتب خانہ پٹنہ کے ایک مخطوطہ[3] سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس میں امیر سعود بن عبد العزیز کی طرف سے فارسی میں فتح علی شاہ قاچار کے نام ایک خط ہے جس میں باشندگانِ نجف کے مشرکانہ اعمال کی برائی کے ساتھ ساتھ ان کے قتل کا بھی ذکر ہے۔ نیز یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اگر فتح علی شاہ نے ان برائیوں کے قلع قمع کرنے کی کوشش نہ کی، تو امیر نجد کو مجبوراً سخت کارروائی کرنا پڑے گی۔ اس خط کے ساتھ فتح علی شاہ کا جواب بھی ہے جس میں شاہ قاچار نے امیر نجد کو تنبیہ اور ان "مظالم" سے باز رہنے کی تاکید کی ہے۔ خط سے

---

[1] عنوان المجد: ج: ۱ ص ۱۲۲-۱۲۱ [2] حاضر العالم الاسلامی: ج: ۴، ۱۶۲

[3] فہرست مشرح انگریزی Catalogue Raisonne: ج ۱۴: ۱۳۲۶-۱۳۲۷

پیلے مختصر الفاظ میں شیخ الاسلام کی دعوت کی تشریح (افادات) ہے۔ یہ افادات، سعود بن عبدالعزیز کی طرف سے ہیں اور اصل مکتوب امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود کی طرف سے لکھا گیا ہے۔ حملۂ کربلا کے وقت امیر عبدالعزیز حکمران تھا اور سعود بن عبدالعزیز ولی عہد اور سپہ سالار، اس لئے دونوں کا نام ہونا قرین قیاس بھی ہے۔

یہ مختصر مخطوطہ ۱۲۱۹ھ، ۱۸۰۴ء کا لکھا ہوا ہے، یعنی واقعہ کے صرف ڈھائی سال بعد اس کی کتابت ہوئی ہے۔ خطوط پر تاریخ درج نہیں، بہر حال وہ حملۂ کربلا سے متصل ہی لکھے گئے ہیں اور اس میں فتح علی شاہ کے مجوزہ حملہ کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر ہمیں فلبی کے بیان[1] سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۰۸ء میں فتح علی شاہ اور سعود بن عبدالعزیز کے تعلقات اچھے اور دوستانہ تھے، اس لئے ہم شاہ ایران کے مجوزہ حملہ نجد کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

رہا سلیمان پاشا، حاکم عراق کا حملہ سو اس کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ ۱۲۱۷ھ میں یعنی حملۂ کربلا کے کچھ ہی بعد اس کا انتقال ہو گیا[2]۔

صلح کا خاتمہ ۱۲۱۷ھ

واقعہ خرمہ کے بعد جو صلح فریقین کے درمیان ہوئی تھی، وہ بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ شریف غالب کو نجدی فوجوں کی زیادتی اور معاہدے کی خلاف ورزی کی شکایت ہوئی۔ خطوط سے مسئلہ طے نہ ہوا، تو شریف نے اپنے وزیر عثمان مضایفی کو گفت و شنید کے لئے بھیجا، لیکن وہ وہاں جا کر ان کے حلقہ میں داخل ہو گیا۔ اور واپسی پر اپنے نئے حلیفوں کی طرف سے غالب کو دعوت مبارزت دی۔

---

[1] Arabia صـ ۹۰ ؛ [2] عنوان المجد، ج ۱، صـ ۱۲۲ ؛

اِدھر غالب اور اس کے بھائی عبدالمعین میں اَن بن ہو گئی۔ عبدالمعین نے سعود سے مدد طلب کی۔ طائف کے قریب ایک جھڑپ ہوئی۔ پھر غالب طائف میں قلعہ بند ہو گیا، لیکن اسے زک اٹھانا پڑی۔ اور طائف پر سعودی فوج کا قبضہ ہو گیا، اور عثمان مضایفی حجاز کا حاکم مقرر ہوا[1]۔ اور نجدی توجیں اطراف و نواح میں پھیل گئیں، اب ان کا رخ مکہ مکرمہ کی طرف تھا۔

حج کا موسم قریب تھا۔ شامی قافلہ عبداللہ پاشا کی سرکردگی میں حرم سے صرف تین دن کے فاصلہ پر آکر رکا۔ سعود سے صلح ہو گئی۔ شرط یہ ہوئی کہ قافلہ تین دن میں مراسم حج سے فارغ ہو کر اُلٹے پاؤں واپس چلا جائے۔ غالب نے عبداللہ پاشا سے درمیان میں پڑنے کی درخواست کی لیکن وہ شرط کے مطابق حج سے فارغ ہوتے ہی واپس ہو گیا، اور غالب کی التجا بے کار ثابت ہوئی[2]۔

مکہ مکرمہ کا فاتحانہ داخلہ
محرم ۱۲۱۸ھ (اپریل ۱۸۰۳ء)

حج کے ختم ہوتے ہی غالب نے جدّہ جاکر پناہ لی اور سعود بن عبدالعزیز، یوم شنبہ محرم الحرام (۳۰[3] اپریل ۱۸۰۳ء) کو ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ مکرمہ داخل ہوا۔ باشندوں کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں کی گئی۔ امیر سعود بن عبدالعزیز نے غالب کے بھائی عبدالمعین کو مکہ مکرمہ کا امیر مقرر کیا، اور خود "اصلاح" کی طرف توجہ کی۔

---

[1] اواخر ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۳ء ؛ [2] عنوان ج ۱ ص ۱۲۲/۲ ؛ فلبی ص ۸۳ ؛

[3] ڈکشنری آف اسلام (ص ۶۶۰) میں داخلۂ مکہ کی "تاریخ" ۲ اپریل دی گئی ہے، جو غلط ہے۔ غالباً زیمر (ص ۱۹۴) نے بھی اسی سے یہ غلطی نقل کی ہے ؛

"...... سعود نے باشندوں کو امان دی اور صدقات و عطیات دل کھول کر تقسیم کیے۔ جب سعود اور 'مسلمان' طواف اور سعی سے فارغ ہوئے، تو اہل، نواحی قبوں اور شرکیہ 'مشاہد' کے انہدام پر مامور کیے گئے۔

مکہ کے ہر حصہ میں اس قسم کی چیزیں بہ کثرت تھیں۔ سعود نے کوئی بیس دن قیام کیا۔ اور اس دوران میں 'مسلمان' ان قبوں کو گراتے رہے تا آنکہ مکہ کے تمام 'مشاہد' اور 'قبے' زمین کے برابر کر دیئے گئے"[۱]

سعود، عبد المعین کو 'امیر' بنا کر، خود حرم کو شرکانہ آلودگیوں سے پاک کرنے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کعبہ کے جواہرات اور قیمتی ذخیرے فاتحین میں تقسیم کر دیئے گئے۔ قبے گرائے گئے اور بعض مجاور قتل بھی کیے گئے[۲]

ابن بشر جواہرات کی تقسیم اور مجاوروں کے قتل کا بالکل ذکر نہیں کرتا۔

یہ سعود کے داخلہ مکہ کا ایک رخ تھا، جو شاید عام لوگوں کے نزدیک مقبول نہ ہو۔ اس 'فتح' کا دوسرا 'رخ' بھی ملاحظہ ہو۔ ایک پادری Hughes کا بیان ہے:۔

"حرم کی تقدیس کے باعث باشندوں کو ادنیٰ گزند نہیں پہنچا! در اہل نجد کے صاحب امر ہونے کے بعد مسجدیں اس طرح آباد ہوئیں کہ 'بلد امین' میں طاعت و زہد کی یہ مثال عہد نبوت کے بعد دیکھنے میں نہیں آئی تھی"[۳]

---

[۱] عنوان ج ا $\frac{۱۲۲}{۳ و ۲}$ - [۲] فلبی: ۸۳ - [۳] ڈکشنری آف اسلام ص ۶۶۰ -

ایک اور یوروپی معاصر دبرک ہارٹ، لکھتا ہے:

"مقدس شہر میں داخل ہونے پر فوج نے کوئی ناروا حرکت نہیں کی۔ تمام دکانیں دوسرے روز کھل گئیں اور فوجیوں نے ضرورت کی تمام چیزیں نقد قیمت دے کر خرید کیں"[۱]

ایک دوسری جگہ یہی برک ہارٹ لکھتا ہے:-

"اہلِ مکہ اب تک سعود کا نام جذبۂ امتنان کے ساتھ لیتے ہیں مختلف زیارتوں اور حج کے موقعوں پر فوج کا قابلِ تعریف رویہ، خاص طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ بلد الحرام میں پہلے داخلے کے وقت اس کی سپاہ کا منصفانہ برتاؤ اب تک ان کے ذہن سے محو نہیں ہوا"[۲]

اس کے علاوہ نماز باجماعت کی پابندی پر مجبور کیا گیا اور ریشمی کپڑے اور تمباکو نوشی کے سامان ضائع کر دیئے گئے، غیر اسلامی ٹیکس اور چنگیاں روک دی گئیں[۳] مکرر جماعتیں بھی روک دی گئیں۔ اور مختلف فقہی مذاہب کے علماء مختلف وقتوں میں امامت کرنے لگے[۴]

اہلِ نجد کے عقائد اور طریقِ عمل کی توضیح کے لئے شیخ عبداللہ بن شیخ الاسلام کے

---

[۱] Notes on Bedouins etc. ج ۲ ص ۱۹۵ نیز Brydge کی کتاب A brief History of the Wahhaby

[۲] ج ۲ ص ۱۴۹ ؛ [۳] الہدیۃ السنیۃ ص ۴۳ ؛

[۴] خلاصۃ الاحکام ص ۲۷۸ ؛

قلم سے لکھوا کر ایک رسالہ عام طور پر تقسیم کیا گیا[1]۔ اس رسالے میں قبوں اور زاویوں کے انہدام کا صاف صاف ذکر کیا گیا ہے، نیز دوسرے مختلف فیہ مسئلوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ دحلان[2] کے بیان کے مطابق شیخ الاسلام کے رسالہ کشف الشبہات کے پڑھنے پڑھانے کا بھی حکم ہوا۔

ابھی غالب کے جدہ میں پناہ لینے کا ذکر آ چکا ہے، مکہ مکرمہ میں صرف چودہ دن قیام کے بعد سعود نے اس کا تعاقب کیا (۲۲ محرم ۱۲۱۸ھ) لیکن حملہ میں ناکام رہا۔ اس کی سپاہ پلیگ کا شکار ہو گئی۔ مجبوراً اسے سردست حجاز کا خیال چھوڑنا پڑا۔ مکہ میں اس کے دو سو آدمی رہ گئے تھے، جو بری طرح ذبح کئے گئے[3]۔

امیر عبدالعزیز کی شہادت رجب ۱۲۱۸ھ

۱۸ رجب ۱۲۱۸ھ (۴ نومبر ۱۸۰۳ء) کو امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود حسب معمول درعیہ میں عصر کی نماز پڑھا رہا تھا کہ عین سجدہ کی حالت میں ایک جفاکار نے اسے خنجر سے شہید کر دیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ قاتل کوئی ایرانی یا کردی[4] شیعہ تھا۔ جس کے کئی لڑکے کربلا میں

۱؎ الہدیۃ السنیۃ ص ۴۰۔ ص ۴۱۔ ۲؎ خلاصۃ الکلام ص ۲۷۹۔

۳؎ حاضر العالم الاسلامی ج ۴ ص ۱۶۲، فلبی ص ۸۳۔ ۴؎ عام مورخ قاتل کو ایرانی شیعہ بتاتے ہیں (فلبی ص ۸۴، حاضر ج ۴ ص ۱۶۳) لیکن ابن بشر (۱/ ۱۲۳) کردی بتاتا ہے اور پھر "قیل" کے ساتھ شیعی بھی کہتا ہے۔ یہ "قیل" اس لیے کہ کرد شیعہ نہیں بلکہ کٹر سنی ہیں (... واللہ اعلم لان الاکراد لیسوا اہل رفض ولا فی قلوبہم غل علی المسلمین ج ۱ ص ۱۲۴) ابن بشر اس قاتل کا نام عثمان بتاتا ہے جو موصل کے پاس ایک قصبہ عمادیہ کا رہنے والا تھا۔

نجدیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے، اور وہ انتقام کے ارادہ سے درعیہ میں قیام پذیر تھا۔ عزیب صورت اور درویش منش پاکر، امیر عبد العزیز نے اس کی کافی خاطر و مدارات بھی کی۔ ایک سال انتظار کے بعد آخر اسے موقع ملا اور امیر عبد العزیز کا کام تمام کر کے اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

عبد العزیز بن محمد بن سعود نے ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء سے ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء تک کُل اڑتالیس سال حکومت کی اور اس حکومت کا بیشتر حصہ خود شیخ الاسلام کی نگرانی میں گزرا۔ ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء تک عبد العزیز نے نمایاں حیثیت تو اپنے والد ہی کے عہد میں حاصل کر لی تھی اور تمام اہم معرکے (۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء سے ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء) اسی کی قیادت میں سر ہوئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے دورِ حکومت میں تمام اہم لڑائیاں اس کے ولی عہد سعود بن عبد العزیز کی سرکردگی میں لڑی گئیں۔ امیر عبد العزیز نے خود شیخ الاسلام کی صحبت اٹھائی تھی، اس لیے تبلیغ و دعوت کا شوق اس کے دل و دماغ میں سمایا ہوا تھا۔ جو علاقہ فتح ہوتا، وہاں وہ سب سے پہلے مبلغین اور متطوعین کا تقرر کرتا۔ رعایا پر رحم دلی اس کی ضمیر میں داخل تھی۔ یہ موقع تفصیل کا نہیں۔ اس کے محاسن و معمولات، ابن بشر[1] نے اچھی طرح بیان کئے ہیں۔ ہم صرف قاضی محمد بن علی شوکانی (۱۱۷۳ھ/۱۷۶۰ء - ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) کی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں۔ شوکانی[2]، امیر عبد العزیز کے معاصر تھے اور ان پر شیخ الاسلام کی ہم مشربی کا[3] "الزام" بھی نہیں عائد کیا جا سکتا۔

"....جو اس کی حکومت میں داخل ہوتا، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور تمام شعائر

---

[1] ج ا ص ۱۲۸۔ [2] ص ۱۲۴۔ [3] ملاحظہ ہو: باب چہارم "دعوت" اور باب پنجم "غلط بیانیاں"۔

اسلام کا پابند ہو جاتا۔ اس کے حلقہ طاعت میں شام . . . کے عرب داخل ہوئے اور فرائض دین کے سخت پابند ہو گئے، حالانکہ اس سے پہلے وہ اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے، اور غلط سلط کلمۂ شہادت ادا کرنے کے سوا کوئی رکن ادا نہیں کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اس سے پہلے وہ بالکل جہالت میں گھرے ہوئے تھے اور اب نمازیں وقت پر ادا کرنے لگے ہیں؎۱

برک ہارٹ؎۲ نے بھی اس کی تبلیغی کوششوں، قاضیوں کا تقرر اور ان کی انصاف پروری وغیرہ کا شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

سعود بن عبدالعزیز ۱۲۱۸ھ – ۱۲۲۹ھ / ۱۸۰۳ء – ۱۸۱۴ء

امیر عبدالعزیز کی شہادت کے بعد اس کا بیٹا سعود امیر مقرر ہوا۔ سعود کے لئے 'امارت' کی بیعت شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں ان کی ایماء سے لی جا چکی تھی؎۳۔

سعود زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اپنے باپ کے نقش قدم پر دعوت و حکومت کی توسیع میں سرگرم ہو گیا۔ اور دور دراز کے فوجی مہمات کی سرکردگی اپنے بیٹے عبداللہ کے سپرد کی۔ عبداللہ نے ایک طرف حجاز میں خیبر کو سرنگوں کیا، اور دوسری طرف بحرین، عمان اور راس الخیمہ تک اپنی فتوحات کی دھاک بٹھا دی۔

اب باب عالی کو بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ علی پاشا حاکم عراق، عبداللہ پاشا حاکم دمشق اور شریف پاشا، حاکم جدہ تینوں کو اس خطرہ کی بیخ کنی کا حکم ہوا۔ عراق میں

؎۱ البدر الطالع ج ۲ صـ ۵۔ ؎۲ صـ ۲۹۔

؎۳ د ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء روضۃ الافکار ج ۲ صـ ۱۵۲، عنوان المجد ج ۱ صـ ۸۳۔

عربوں اور کردوں کی ایک بڑی فوج تیار کی گئی، لیکن یہ تیاریاں وقت پر مکمل نہ ہوئیں۔ ادھر سعود کو موقع ملا، اور اس نے بصرہ پر دھاوا کر دیا۔ علی پاشا محلہ میں قلعہ بند تھا، اسے چھوڑ کر نجدی فوجیں زبیر پر حملہ آور ہوئیں اور وہاں کے تمام قبے اور غیر شرعی مشاہد گرا کر واپس ہوئیں۔[1] سعود تو کامیاب لوٹا اور علی پاشا کردستان کی ایک بغاوت فرو کرنے میں الجھ گیا اور اس کی مہم ناکام رہی۔[2]

مکہ مکرمہ کی دوبارہ فتح ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۶ء

اب سعود کو ہر طرف سے اطمینان ہو گیا۔ عمان اور ساحلی علاقے اس کی برتری اور اقتدار تسلیم کر ہی چکے تھے۔ عراق کی طرف سے جو اطمینان ہوا، تو اس نے پھر حجاز کو زیر نگیں کرنے کا تہیہ کیا۔[3] عثمان مضایفی نے بلا پس و پیش طائف پر قبضہ کر لیا، اور ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء کے آغاز میں اہل مدینہ نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ اور "سمع و اطاعت" کا عہد کیا۔ حسب دستور مدینہ منورہ میں عام قبروں کے قبے اور زیارت گاہیں منہدم کر دی گئیں۔[4]

اس اثنا میں نجدی فوجیں، جو آس پاس کے تمام علاقوں پر قابض ہو چکی تھیں،

---

[1] ذی الحجہ ۱۲۱۸ھ ، مارچ - اپریل ۱۸۰۴ء۔

[2] عنوان ج ۱ ص۱۳۰؛ فلبی ص۸۷ ۔ ص۸۸

[3] ذی قعدہ ۱۲۱۹ھ / فروری ۱۸۰۵ء۔ [4] عنوان ، ص۱۳۵؛ اسٹاڈرڈ (دی نیو ورلڈ آف اسلام: ص۳۱) اور Hughes (ڈکشنری آف اسلام ص۶۶) وغیرہ نے قبۃ الرسول کے انہدام کا ذکر کیا ہے۔ جو یکسر غلط ہے۔ (تفصیل غلط بیانیوں کے باب میں)

مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ حج کا زمانہ قریب آگیا تھا، شامی قافلہ محاصرہ کی وجہ سے رک گیا۔ ادھر اہلِ مکہ پریشان ہوئے۔ مجبوراً غالب نے امان طلب کی اور سعود کی اطاعت کا عہد کیا۔[1] شامی قافلہ کو حج کی اجازت ملی۔ غالب نے اطاعت کے ثبوت میں سعود کے پاس تحفے بھیجے اور اس نے اپنے سرداروں عبدالوہاب ابو نقطہ اور عثمان مضایفی کے منظور کردہ صلح کی تصدیق کی۔ پھر کیا تھا "امن و خوش حالی کا دور دورہ ہوا قحط سالی ختم ہوئی، اور تمام راستے پر امن ہو گئے"[2]

دو یورپی محقق (برک ہارٹ اور برائج) جو ان واقعات کے تقریباً عینی شاہد ہیں ان سب سے الگ واقعہ کی نئی صورت پیش کرتے ہیں:

> "مدینہ منورہ ۱۸۰۴ء میں فتح ہوا۔ وہاں ایک شخص حسن قلعی شہر پر قابض ہو گیا تھا، اور شہر کو سعود کے سپرد کرنے سے پہلے، قبہ شریف کے خزانے پر قبضہ کر کے، اس نے اپنے خاص لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ فتح کے کچھ ہی بعد سعود مدینہ پہنچا اور قبہ کھول کر، جو تھوڑا بہت

---

1. اواخر ۱۲۲۰ھ جنوری یا فروری ۱۸۰۶ء۔ 2. عنوان المجد ج ا ص ۱۳۳ تا ۱۳۴۔ یہ قحط سالی ذی الحجہ ۱۲۱۹ھ سے ذی قعدہ ۱۲۲۰ھ تک رہی (خلاصۃ الکلام، ص ۲۸۵) نجد و یمن پر بھی اس قحط کا اثر پڑا، لیکن سب سے زیادہ تنگی مکہ مکرمہ میں محسوس ہوئی۔ جنگ اور محاصرہ کی وجہ سے باشندے یونہی چور تھے، قحط نے بالکل ادھ موا کر دیا۔ قلعی نے فتح مکہ کے ساتھ سلب و نہب کا بھی ذکر کیا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ احمد زینی دحلان نے حسب عادت "وہابیوں" کو بے شمار گالیاں دی ہیں، لیکن اس "قتل و نہب" کا بالکل ذکر نہیں کیا (خلاصۃ الکلام، ص ۲۹۲)۔

بچ گیا تھا، اپنے قبضے میں کر لیا۔[1]

سعود کا تیسرا حج
۱۲۲۱ھ
۱۸۰۶ء

سعود کے دو حج[2] پہلے مذکور ہو چکے ہیں۔ اب دوبارہ فتح مکہ کے بعد پھر اسے زیارت بیت اللہ اور اپنی تبلیغی کوششوں کی تکمیل کا موقع ملا

تیسرے حج کا ارادہ کر کے وہ ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۲۱ھ (۲۱ جنوری ۱۸۰۶ء) کو درعیہ سے روانہ ہوا، مکہ مکرمہ پہنچ کر اس نے اپنی حیثیت اور منصب کے مطابق صدقات وعطیات تقسیم کئے۔ ذی الحجہ کے آخر میں مدینہ منورہ روانہ ہوا۔ اور وہاں انتظامی امور ٹھیک کر کے لوٹ گیا۔ احمد دحلان حجرہ شریفہ کے زر و جواہر کے نکال لینے کا ذکر کرتا ہے،[3] لیکن ابن بشر ساکت ہے۔ بلنٹ[4] اور دوسرے یورپی مورخ بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ابن بشر کے سکوت کی وجہ سے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اگر نجف کی طرح حجرۂ نبویہ کے زر و جواہر بھی سعود تصرف میں لاتا، یا سپاہیوں میں تقسیم کرتا، تو یہ نجدی معاصر ضرور ذکر کرتا۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک یہ کوئی مذموم فعل تھا ہی نہیں۔ نجف وکربلا میں اس قسم کے واقعات بخود ابن بشر کی زبانی گزر چکے ہیں۔

البتہ جبرتی[5] خود عبد اللہ بن سعود کی زبانی، زر و جواہر کے لینے اور پھر ان کی واپسی کا ذکر کرتا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ واقعہ صحیح ہو اور ابن بشر نے نظر انداز کر دیا ہو۔

---

۱ - برک ہارٹ ج ۲ ص ۹، ۱۹۸؛ براج ص ۳۳-۳۴؛ ۲ - سنہ ۱۲۱۴ھ اور سنہ ۱۲۱۵ھ

۳ - خلاصۃ الکلام ص ۲۹۴۔

۴ - A pilgrimage to Nejd ج ۲ ص ۲۵۶

۵ - عجائب الآثار ج ۴ ص ۲۹۹

اس سفر میں چند خاص باتیں ہوئیں۔ شامی قافلے کو شرطوں (باجے گاجے سے پرہیز وغیرہ) کی عدم تعمیل کے باعث واپس ہونا پڑا۔[1] سعود نے ترک فوجوں کو مکہ مکرمہ چھوڑنے پر مجبور کیا اور غالب نے سعود کے ہاتھ پر بیعت کی۔[2] اس حج میں سعود کے ساتھ اس کے تمام امراء اور اہل نجد و نواح نجد کی بڑی تعداد ساتھ تھی۔

حج اور اصلاحات ١٢٢٣ھ

١٢٢١ھ/١٨٠٦ء میں تیسرا حج ہوا، اور اس کے بعد ١٢٢٧ھ/١٨١٢ء تک اس نے ہر سال حج کیے۔ حج و اجتماع کے ان موقعوں پر وہ اپنی تبلیغی کوششوں سے کبھی غافل نہیں رہا۔ مختلف سالوں میں اس نے مختلف احکام نافذ کیے۔ مصری اور شامی محمل روک دیے گئے۔ نیز قافلوں کے ساتھ باجے گاجے کی یک لخت ممانعت کر دی۔[3]

مکہ مکرمہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بول بالا ہوا۔ بازاروں میں اب تمباکو پینے والا نظر نہیں آتا۔ سعود نے خاص طور پر نماز کے لیے محتسب مقرر کیے۔ اذان ہوتے ہی بازاروں میں "الصلوٰۃ الصلوٰۃ" کی منادی ہوتی۔[4]

١٢٢٥ھ/١٨١١ء میں خود ابن بشر زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوا، وہ اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کرتا ہے۔

"میں نے بھی اس سال حج کیا۔ میں نے سعود کو احرام کی حالت میں ایک سواری

١۔ خلاصۃ الکلام ص ٢٩٤ ٢۔ عنوان ج ١ ص ١٣٨۔

٣۔ خلاصۃ الکلام ص ٢٩٤

٤۔ ١٢٢٣ھ/١٨٠٩ء، عنوان ج ١ ص ١٤١

(اونٹ) پر دیکھا۔ اس سواری پر کھڑے ہو کر اس نے ایک بلیغ خطبہ دیا
جس میں لوگوں کو نصیحت کی اور آداب حج بتائے اور انھیں کلمۃ لا الٰہ
الا اللہ کی برکتیں (اتحاد، امن، دولت کی فراوانی اور سرکشوں کی اطاعت)
یاد دلائیں۔ اس نے کہا کہ وہ ایک کمزور سے کمزور کو قوی سے قوی کے
مقابلہ میں اس کا حق دلا کر رہے گا۔ اسی سواری پر سے اس نے منادی کی:۔
مکہ مکرمہ میں کوئی ہتھیار نہ اٹھائے اور کوئی عورت آراستہ و پیراستہ ہو کر نہ نکلے۔
اور اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا کی دھمکی دی۔ اور بازاروں
میں نماز پر آمادہ کرنے کے لیے خاص آدمی مقرر کیے۔ اب تم نماز کے وقت
شاید ہی کسی کو برگشتہ پاسکو۔ اور ان تمام سالوں میں، بازار میں کوئی تمباکو یا
دوسری مسکرات کھلم کھلا استعمال کرنے کی جرأت نہ کر سکا[1]

۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۲ء کے متعلق ابن بشر لکھتا ہے:۔
"اور مکہ مکرمہ میں اب کوئی منکر چیز (تمباکو نوشی، ترک صلوٰۃ اور غیر اللہ
کی قسم کھانا) نہیں دکھائی پڑتی"
سعود بن عبدالعزیز کی اصلاحات کا سب سے زیادہ مفصل ذکر جبرتی کرتا ہے
محرم ۱۲۲۱ھ کے حوادث میں شریف غالب اور امیر سعود کی باہمی مصالحت
کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے:۔
"...... منکرات کی گرم بازاری اس نے قطعاً روک دی۔ اسی طرح مسی

---

[1] عنوان ج ا ص ۱۸۱

اور صفا و مروہ کے درمیان تمباکو نوشی بھی بند کر دی۔ جماعت کے ساتھ نمازوں کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا۔ ریشمی کپڑوں کے استعمال کی بھی ممانعت کی۔ ناروا محصول اور عام مظالم روک دیئے گئے اور وہ لوگ (اہل مکہ اور شریف مکہ) اس بارے میں حد سے گزر چکے تھے۔ اور تو اور وہ ہر لاش پر پانچ یا دس فرنک ٹیکس لیتے تھے، اور اگر مردے کے اعزا مقررہ محصول نہ ادا کر سکتے، تو انہیں لاش اٹھانے اور دفن کرنے کی اجازت نہ ملتی..... اس کے علاوہ بے شمار بدعتیں اور نت نئے ناروا محصول انھوں نے ایجاد کر لیے تھے۔ بازار کی خریداری اور گھروں پر بھی محصول عائد ہوتا۔ بسا اوقات انسان اپنے گھر میں اطمینان سے بیٹھا ہوتا؛ اور اسے یک بیک گھر خالی کرنے کا حکم ملتا۔ سرکاری ملازم کہتے کہ "آقا کو اس گھر کی ضرورت ہے اب یا تو گھر خالی کر دو یا پھر کچھ لے دے کر مصالحت کر لو"......

"...... شریف نے ان سب چیزوں کے ترک اور توحید، اتباع رسول اور خلفائے راشدین کے اسوۃ کی پیروی کا عہد کیا اور ان تمام چیزوں سے احتراز کا وعدہ کیا جو لوگوں نے بعد کو پیدا کر لی ہیں، بغیر اللہ سے مدد مانگنا، قبروں پر قبوں کی تعمیر، تصویروں اور نمائشی چیزوں کی بہتات، ہچو کھٹوں کو بوسہ دینا، بغیر اللہ کے لیے تذلل اور خضوع، خلاصہ یہ کہ ان تمام بدعتوں سے اجتناب کا اس نے عہد کیا جن میں کہ مخلوق کو کسی نہ کسی طرح الوہیت کا شریک گردانا جاتا ہے...... ان اصلاحات کے بعد راستے مامون ہو گئے۔ بلکہ مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ اور جدہ اور طائف کے راستے کھل گئے [1]

---

[1] عجائب الآثار ج ۴ ص ۲۳ (ملخص)

برک ہارٹ[1] نے بھی نمازوں پر سختی اور سزاؤں کا ذکر کیا ہے۔

بعض دوسری فتوحات اور لڑائیاں

حجاز کی فتح پر سعود کی فوجی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئیں ۱۲۲۳ھ ۱۸۰۸ء میں اس نے نجف پر حملہ کیا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔[2] راستے میں سماوہ اور زبیر پہ حملے کئے گئے۔

ربیع الآخر ۱۲۲۵ھ (جون ۱۸۱۰ء) میں سعود نے شام کا قصد کیا اور متعدد حملوں کے بعد کافی مال و متاع لے کر کامیاب لوٹا۔[3] اور ابن بشر کے بیان کے مطابق:

"اس غزوہ کی وجہ سے اہل شام کے دلوں پر سعود کی دھاک بیٹھ گئی۔"

بصرہ اور اس کے نواح پر بار بار حملے ہوئے، لیکن کوئی پائدار فائدہ نہیں ہوا۔

راس الخیمہ ۱۲۲۴ھ

ان لڑائیوں کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے بھی ایک جھڑپ ہوئی۔ خلیج فارس کے باشندے جو قبیلہ جواسم سے تعلق رکھتے تھے، عرصہ سے تجارتی جہازوں پر دھاوے کیا کرتے اور کامیاب رہتے تھے۔ اب سالہا سال سے عمان اور خلیج فارس کے ساحلی علاقوں پر سعود کا سکہ چلتا تھا، اور یہ بحری سپاہی (قرصان) بھی سعود ہی کے زیر نگیں تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں اس "بحری تاخت" کے روک تھام کی انگریزوں نے بڑی کوششیں کیں اور آخر حکومت بمبئی نے ستمبر ۱۸۰۹ء (رمضان ۱۲۲۴ھ) میں ان کے مرکز راس الخیمہ پر سخت حملہ کیا اور قرصان کے بیڑے کو کاری ضرب لگائی۔[4] ۱۲ نومبر ۱۸۰۹ء (شوال ۱۲۲۴ھ) تک راس الخیمہ جلا کر راکھ کیا جا چکا

---

[1] ص ۱۴۷ ۔ [2] عنوان ج ۱ ص ۳۵ ۔ [3] عنوان ج ۱ ص ۱۴۸-۹

[4] عنوان ج ۱ ص ۱۴۶؛ فلبی ص ۹۲ ۔

تھا۔ اور قرصان کو اپنا راس الخیمہ کا مرکز چھوڑنا پڑا۔

گو اس شکست سے نجدیوں کی مقامی ساکھ قائم رہی اور عمان کے اندرونی علاقوں میں ان کی عسکری تگ و تاز جاری رہی۔ پھر بھی زویمر کے الفاظ میں :-

"مصریوں سے پہلے اہل نجد کو جو سب سے سخت دھکا لگا، وہ یہی برطانیہ کے ہاتھوں تھا۔ ۱۸۰۹ء میں بمبئی سے الگ ایک انگریزی مہم ان کے خاص بحری مستقر اور مرکز راس الخیمہ کے "قزاقی" (Piratic Inhabitants) "باشندوں" کے خلاف پہنچی۔ مرکز پر بمباری کی گئی اور جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔[1] براہنچ نے وہابیوں[2] کی 'زیادتیوں' اور راس الخیمہ پر حملہ اور پھر ان 'سزایابی' کی مفصل روداد بیان کی ہے۔ اور کرنل اسمتھ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "وہابی کی طاقت پر یہ پہلی اخلاقی ضرب تھی"۔

مصریوں کا حملہ ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء

اواخر ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء میں مصریوں کا حملہ شروع ہوا۔ اس وقت نجدی حکومت کا اثر شمال میں حلب سے لے کر بحر ہند تک اور مشرق میں خلیج فارس اور عراق سے لے کر بحر قلزم تک پھیلا ہوا تھا۔ اور راس الخیمہ کی زک کو چھوڑ کر اب تک اس جواں سال حکومت کو کوئی قابل ذکر صدمہ بھی نہیں پہنچا تھا۔

نجدی اثر و اقتدار کی خبریں آستانہ پہنچ رہی تھیں۔ بغداد، دمشق اور جدہ کے حاکم عاجز آچکے تھے۔ آخر باب عالی نے تنگ آکر محمد علی پاشا خدیو مصر کو اہل نجد کی سرکوبی پر مامور کیا۔[3] کہا جاتا ہے کہ یہ ۱۸۰۴ء میں اسی شرط پر مصر کا پاشا بنایا گیا تھا۔ سانپ

---

[1] Arabia: The Cradle of Islam۔

[2] براہنچ: ص ۴۴-۴۵ ؛ نیز برک ہارٹ: ص ۲۰۰۔ [3] سنہ ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء۔

مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے" شاید ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہو۔ محمد علی[1]، خدیو مصر کی روز افزوں طاقت بھی باب عالی کے لئے مستقل خطرہ بنتی جا رہی تھی۔ آل سعود اور خدیو مصر دونوں کی ٹکر آستانہ کے عرش نشینوں کے لئے بہر حال فائدے سے خالی نہیں تھی۔

محمد علی کا بیٹا طوسون (ف ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۶ء) دس ہزار فوج لے کر ساحل پر اترا اور بآسانی ینبع پر قابض ہو گیا[2]۔ اس کے بعد وہ مدینہ کی طرف بڑھا۔ راستے میں جدیدہ کی تنگ گزرگاہ کے قریب سعود کے بیٹوں، عبداللہ اور فیصل نے جم کر مقابلہ کیا اور شکست دی تقریباً بارہ سو مصری مقتول ہوئے[3]۔ اور طوسون کو پھر ینبع کی طرف ہٹنا پڑا[4]۔

طوسون کچھ دنوں ینبع پڑا رہا۔ پھر اس نے مدینہ کی طرف پیش قدمی کی اور دو ماہ کے محاصرے کے بعد مصری مدینہ منورہ پر قابض ہو گیا[5]۔

طوسون فوراً جدہ پہنچا۔ عبداللہ بن سعود، جو حجاز میں نجدی افواج کا سردار تھا مکہ مکرمہ خالی کرنے پر مجبور ہوا۔ اور بلد الحرام پر بلا کسی پس و پیش کے مصریوں کا قبضہ ہو گیا[6]۔ کچھ ہی دنوں کے بعد طائف بھی ان کے قبضہ و اقتدار میں آ گیا۔ اور احمد دحلان

---

[1] محمد علی پاشا، مصر کے سابق شاہی خاندان کا مورث اعلیٰ تھا۔ غالباً یہ البانوی نسل کا تھا۔ گو اس کے جانشین ابراہیم پاشا کا یہ قول مشہور ہے، کہ "عربی زبان و تمدن نے ہمیں عرب بنا دیا"۔ محمد علی کی ولادت ۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ء میں اور وفات ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء میں ہوئی۔ [2] ۱۸۱۱ء / ۱۲۲۶ھ۔

[3] برک ہارٹ: ۲۳۱۔ [4] اواخر ذی قعدہ ۱۲۲۶ھ / دسمبر ۱۸۱۱ء۔ مارگولیتھ نے مصریوں کی شکست کی تاریخ ۷ ذی قعدہ ۱۲۲۶ھ (۲۳ نومبر ۱۸۱۱ء) دی ہے۔ برک ہارٹ (صفحہ ۳۳۹) اور برائجز (صفحہ ۵۱) نے پیش قدمی کی تاریخ جنوری ۱۸۱۲ء لکھی ہے۔

[5] ذی قعدہ ۱۲۱۰ھ / نومبر ۱۸۱۲ء: عنوان جلد اول ص ۱۵۸؛ فلبی ص ۹۴۔

[6] محرم ۱۲۲۸ھ / جنوری ۱۸۱۳ء؛ عنوان: ص ۱۶۰۔

کے بیان کے مطابق اس فتح کی خوشی میں تمام مصری قلمرو میں پانچ روز جشن منایا گیا۔ اس کے بعد طائف سے تربہ کے قریب سخت معرکہ پیش آیا اور مصریوں کو شکست ہوئی[1] تربہ کے اس واقعہ کے بعد سعود کے گورنر عثمان مضایفی کی ہمت بڑھی۔ اور پھر اس نے طائف کی طرف پیش قدمی کی۔ لیکن اب کے اسے زک ہوئی۔ اس کے بہت سے آدمی کام آئے اور آخر وہ خود گرفتار ہوا۔[2] اور غالب نے اسے محمد علی پاشا کی خدمت میں مصر بھیج دیا۔ محمد علی نوحجاز کے لئے رخت سفر باندھ چکا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں عثمان مضایفی کو ایک خچر پر بٹھا کر پورے قاہرہ میں گشت کرایا گیا، اور اس کے بعد وار الحکومت (آستانہ) بھیج دیا گیا، جہاں موت اس کا انتظار کر رہی تھی[3] احمد دحلان جس نے عثمان مضایفی کی برائی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی[4] اس بے رحمانہ قتل پر اظہار افسوس کرتا ہوا لکھتا ہے:

"عثمان مضایفی جب مصر پہنچا، تو محمد علی پاشا کے ارباب حکومت اس کی گفتگو اور فصیح زبان سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کی متانت اور وقار کا ان پر بڑا اثر ہوا۔

---

[1] شعبان ۱۲۲۸ھ / اگست ۱۸۱۳ء؛ عنوان (ص ۱۶۱
[2] ۱۰ رمضان ۱۲۲۸ھ / ۶ اگست ۱۸۱۳ء؛ عنوان بعد ۱۶۲؛ فلبی (ص ۹۶) نے عثمان مضایفی کی گرفتاری اور قتل کے واقعہ کو مؤخر کر دیا ہے۔ احمد دحلان (۲۹۶) اور ابن بشر (۱۶۲) دونوں اس واقعہ کو محمد علی پاشا کی آمد حجاز سے پہلے ذکر کرتے ہیں۔ برک ہارٹ (ص ۲۴۷) اور برائج (ص ۶۱) کا بیان ہے کہ عثمان مضایفی کی گرفتاری پر پانچ ہزار ڈالر انعام رکھا گیا تھا۔ یہ دونوں گرفتاری کی تاریخ ستمبر ۱۸۱۲ء بتاتے ہیں، اور معرکہ بسل کے بعد جس کا ذکر ابھی آتا ہے۔
[3] اواخر ۱۲۲۸ھ / دسمبر ۱۸۱۳ء۔
[4] خلاصۃ الکلام، ص ۲۷۲-۲۷۱۔

اس کے چہرہ سے "امارت" اور "شرافت" کے آثار ظاہر تھے..

..... یہاں تک کہ اکثر لوگ ایسے شریف آدمی کو آستانہ بھیجنے پر اظہار افسوس کرنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ دارالسلطنت پہنچ کر اس کا بچنا ناممکن ہے[1]۔ الخ

جنگ اور فتح کی رفتار سے غیر مطمئن ہو کر خود محمد علی حجاز کے قصد سے روانہ ہو گیا[2] اور اواخر شوال میں اس نے جدہ میں قدم رکھا۔ اس نے آتے ہی پہلے شریف غالب کی امارت کا خاتمہ کیا[3] اور اسے گرفتار کر کے مصر اور وہاں سے سلونیکا بھیج دیا گیا۔ جہاں غریب دو سال کے بعد دار آخرت کو سدھار گیا[4]۔ غالب کے بھتیجے یحییٰ بن سرور کو برائے نام امیر بنایا گیا اور تمام ملکی اختیارات، حجاز کے نئے گورنر احمد پاشا کو دے دیئے گئے۔ حجاز کو بدنام وہابیوں کے پنجہ سے نکال کر مصر کا ایک صوبہ[5] بنا دیا گیا۔ اسی امارت کی خاطر غالب نے کیا نہ کیا؟

---

[1] خلاصۃ الکلام ص ۲۹۶ ملخص ۔ [2] ۱۴ شوال ۱۲۲۸ھ / ۱۰ اکتوبر ۱۸۱۳ء خلاصۃ: ص ۲۹۶

[3] فلبی (ص ۶۵) نے ورود جدہ کی تاریخ ۲۸ اگست ۱۸۱۳ء دی ہے۔ اسی طرح مارگولیوتھ نے اواخر اگست لکھا ہے۔ ابن بشر نے (ص ۱۶۳) قدوم مکہ مکرمہ کی تاریخ صرف ذی قعدہ دی ہے برک ہارٹ (ص ۲۸۱) اور بر ائج (ص ۹۳) ستمبر ۱۸۱۳ء لکھتے ہیں۔ ہم نے یہاں خلاصۃ الکلام پر اعتماد کیا ہے۔ فلبی کی تاریخ واقعات کی ترتیب سے لاگ نہیں کھاتی۔

[4] اواخر رمضان ۱۲۳۱ھ / جولائی ۱۸۱۶ء؛ عنوان: ص ۱۸۵؛ الرحلۃ الحجازیۃ ص ۸۹؛ برک ہارٹ: ص ۲۶۳ ۔

[5] حجاز اس کے بعد ایک عرصہ تک مصر کے تابع رہا۔ اسی دوران میں محمد علی اور باب عالی کے درمیان ان بن ہوئی اور خونریز معرکے ہوئے۔ محمد علی کا بیٹا شام پر بھی قابض ہو گیا۔ اس کے بعد جب سلطان عبدالمجید تخت نشین ہوا (۱۲۵۵ھ) تو حجاز براہ راست آستانۂ خلافت کی حمایت میں آیا (خلاصۃ الکلام: ص ۳۰۸)

"وہ کبھی وہابیوں کے ساتھ چاپلوسی سے پیش آتا، اور ان کے عقائد کی تائید کرتا، کبھی قبّوں کے گرانے کا حکم دیتا، کبھی مؤذنوں کو سلام (بعد الاذان) سے روکتا۔[1]"

یہ سب اس لئے کہ سعود کہیں اسے معزول نہ کر دے۔[2] سعود کا مقصد نیک تھا۔ اس نے غالب کی امارت قائم رکھی۔ محمد علی خالص دنیا دار تھا، اس نے قدم رکھتے ہی سب سے پہلے اسی غریب کا خاتمہ کیا۔ محمد علی نے جس عیّاری کے ساتھ غالب کو گرفتار کیا ہے، اس کا حال خلاصۃ الکلام میں پڑھیے۔[3]

برائج[4] نے بھی غالب کی گرفتاری کی تفصیلات دی ہیں، جو خلاصۃ الکلام سے ملتی جلتی ہیں۔ غالب اور محمد علی کے باہمی نزاع پر بھی اس نے کافی روشنی ڈالی ہے۔[5] غالب اور محمد علی کا ذکر کرتے ہوئے ایک دوسرے موقع پر وہ لکھتا ہے:

"یہ تو اُمیّد ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ محمد علی اور غالب جیسے پرلے درجے کے پختہ مکّار So aecomplished in deceit ایک دوسرے پر اعتماد کر سکیں گے۔[6]"

۱؎ الرحلۃ الحجازیۃ: ص ۸۹ ۔ ۲؎ خلاصۃ الکلام: ص ۲۹۴ ۔

۳؎ اس عیّاری کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد علی نے دعوت کے بہانے سے غالب کو گورنر ہاؤس بلایا۔ اس کے آدمی چھپے ہوئے تھے بیچارے کو نہتا اور بے مددگار پاکر گرفتار کر لیا۔ بزدل حجازی سر پیٹ کر رہ گئے۔ ۴؎ ص ۶۸-۶۹ ۵؎ ص ۶۱-۶۶ ۶؎ ص ۴۷

برک ہارٹ نے بھی محمد علی کی بدنیتی اور مکاری کی بار بار اور سخت شکایت کی ہے[1]۔ لیکن وہ غالب کا مدّاح ہے۔ جب غالب قید ہو کر مصر پہنچا، تو برک ہارٹ وہاں موجود تھا، اور اس نے غالب کی ملاقات کے تاثرات قلم بند کئے ہیں[2]۔

لیکن ابھی محمد علی اور مصریوں کی حالت کوئی ایسی قابل اطمینان بھی نہیں تھی۔ حجاز، عسیر اور یمن کے ساحلی مقامات تو آسانی سے مصریوں کے قبضہ میں آ گئے، لیکن اندرونی علاقے ابھی تک نجدیوں کے زیر اثر تھے۔

مصطفیٰ بے مقابلہ کے لئے بھیجا گیا۔ تربہ کے مقام پر پھر جنگ ہوئی، اور مصریوں کو شکست اٹھانا پڑی[3]۔ عجیب بات یہ ہے کہ نجدیوں نے یہ معرکہ ایک بہادر عورت غالیہ کی سرکردگی میں سر کیا تھا[4]۔ برک ہارٹ نے غالیہ کی توصیف میں زبان قلم کے خوب جوہر دکھلائے ہیں۔

محرم ۱۲۲۹ھ (جنوری ۱۸۱۴ء) میں سمندر سے مصری کمک پہنچی اور قنفذہ کے قریب فریقین میں مٹھ بھیڑ ہوئی اور مصریوں کو شکست ہوئی[5]۔

سعود کی وفات
۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء

ابھی نجدیوں اور مصریوں کی کشمکش اس خطرناک مرحلے سے گزر رہی تھی اور نجدی پھر از سر نو مقابلہ کی تیاریاں کر رہے تھے کہ برات کا دوطھا ہی چل بسا۔ امیر سعود بن عبد العزیز بن محمد بن سعود نے دو شنبہ، ۸ جمادی الاولیٰ،

---

[1] ص ۲۴۲ ۔ [2] ص ۲۶۲-۲۵۹ ۔

[3] اواخر ذی الحجہ ۱۲۲۸ھ / دسمبر ۱۸۱۳ء؛ عنوان ص ۱۶۴-۱۶۳ ۔

[4] برک ہارٹ، ص ۹-۲۶۸ ؛ فلبی، ص ۹۶ ؛ دحلان: ص ۳۰۰ ۔ [5] عنوان، ص ۱۶۴

۱۲۲۹ھ (پہلی مئی ۱۸۱۴ء) کی شب کو دارِ آخرت کی راہ لی۔ اور محمد علی پاشا کی مہم کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ اب نجد کی نئی حکومت کے پھولنے پھلنے کی توقع سرد ہت جاتی رہی۔

سیرت سعود ان لڑائیوں سے الگ بھی، سعود ایک بے مثال امیر اور فرماں روا تھا۔ اس کی پیدائش ۱۱۶۰ھ یا ۱۱۶۳ھ میں ہوئی[۱]۔ شیخ الاسلام جیسا استاذ اور مربی ملا۔ پھر کیا تھا، علم و عمل کا نمونہ بن کر نکلا۔ شیخ الاسلام کے درس میں مسلسل کئی سال تک سعود نے حاضری دی اور حدیث و فقہ میں اچھی دستگاہ حاصل کی۔ اس کے خطبے اور مکتوبات زبان اور علم دونوں کی حلاوت رکھتے ہیں۔

لڑائیوں میں عام طور پر نماز مغرب کے بعد وعظ کہتا اور لوگوں کو صبر و طاعت کی تلقین کرتا۔ نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا اسوہ پیش کر کے انہیں بہادری اور ثابت قدمی پر آمادہ کیا کرتا۔

جنگوں میں انتہائی مخاصمت اور شرارت کے باوجود بچوں، عورتوں، بوڑھوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا جاتا۔ البتہ مالِ غنیمت میں رعایت نہیں ہوتی۔ لڑائی ختم ہوتے ہی "خمس" وضع کر کے مالِ غنیمت سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ سپاہیوں میں بھی "پیادہ اور سوار" کا فرق قائم رکھا جاتا۔ راجل (پیادہ) کو فارس (سوار) کا نصف ملتا۔ خلاصہ یہ کہ جنگوں میں یکسر ٹھیٹھ اسلامی قانون پر عمل کرنے کی کوشش کی جاتی۔

یہ تو رزم کا حال تھا۔ بزم کی کیفیت کچھ اور ہوتی۔ اہل ورعیہ نماز صبح کے بعد روزانہ کسی عام جگہ (قصر سے باہر) جمع ہوتے۔ امیر سعود اور آل سعود صدر نشین ہوتے

---

۱ عنوان المجد: صفحہ ۱۳۶۔ ۲ البدر الطالع ج ۲، ص ۲۶۳

ان کے پہلو بہ پہلو شیخ الاسلام کے اہل خاندان ہوتے، جن کا کوئی فرد درس و وعظ کی خدمت انجام دیتا۔ صبح کی مجلس میں عام طور پر عبداللہ بن شیخ الاسلام درس دیتے۔ اکثر تفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن کثیر کا سبق ہوتا۔ درس سے فارغ ہو کر وہ قصر میں جلوہ افروز ہوتا اور عام مخلوق کی ضروریات سنتا اور ان کی شکایات دور کرتا۔ درمیان میں قیلولہ کا وقفہ ہوتا اور ظہر کے بعد قصر کے اندر درس کی مجلس مرتب ہوتی، لیکن اس وقت آل الشیخ نہ ہوتے۔ ظہر کے بعد ان میں سے ہر ایک کا حلقہ درس الگ الگ جمتا۔ اس سہ پہر کے درس میں خود امیر سعود معلم کی حیثیت سے داد علم دیتا۔ عام طور پر تفسیر ابن کثیر اور ریاض الصالحین کی قرات ہوتی اور سعود تقریر و شرح کرتا۔ درس سے فارغ ہو کر پھر دو گھنٹے رعایا کی شکایات و ضروریات پر توجہ دیتا اور ان کی داد رسی میں مصروف رہتا۔ یہ سلسلہ عصر تک جاری رہتا۔

نماز مغرب کے بعد پھر قصر میں اجتماع ہوتا۔ اعیان و عوام سب حاضر ہوتے۔ عام مجلس ہوتی۔ امیر سعود بھی حاضر ہوتا۔ شیخ سلیمان بن عبداللہ بن شیخ (مقتول ۱۲۳۳ھ) صحیح بخاری کا درس دیتے۔ ابن بشر (جو ان مجلسوں میں حاضر ہوتا رہا ہے) شیخ سلیمان بن عبداللہ کی وسعت نظر کا غیر معمولی طور پر مداح ہے۔[1]

یہ امیر سعود بن عبدالعزیز کی اجمالی سیرت تھی، تفصیل کے لئے عنوان المجد[1] کا مطالعہ کافی ہوگا۔

سعود کے تدبر اور جنگی صلاحیتوں کا بر اکھ[2] بھی خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔ برک ہارٹ[3]

---

[1] ج ۱، ص ۱۶۶-۱۶۵ ؛ [2] ص ۸ ؛ [3] ص ۱۷۰

نے اس کا خاص وصف یہ بتایا ہے ۔

"کہ وہ حملوں میں رازداری اور اخفاء کا بہت خیال رکھتا تھا۔ حوران (شام) پہنچنے میں اسے ۳۵ دن لگے، لیکن اس کے حملے کی خبر صرف دو دن پہلے پہنچ سکی"۔

عبد العزیز بن سعود اور خاص کر سعود بن عبد العزیز کے عہد میں امن و امان کا ذکر کرتے ہوئے برک ہارٹ کہتا ہے[۱]۔

"غالباً پیغمبر عرب کے بعد پہلی بار ملک میں ایسا امن و امان قائم ہوا، کہ بدوؤں کو اپنے مال و متاع اور مویشیوں کی طرف سے بے فکر ہو کر آرام سے سونے کا موقع ملا...... " الخ الخ

اسی طرح رعب کا یہ عالم تھا :-

"کہ ایک معمولی حبشی غلام بڑے سے بڑے قبیلے کے سردار کو یکہ و تنہا گرفتار کر کے درعیہ لے آتا تھا[۲]"

عبد اللہ بن سعود بن عبد العزیز
۱۲۲۹ھ ـ ۱۲۳۳ھ
۱۸۱۴ء ـ ۱۸۱۸ء

سعود کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا عبد اللہ جانشین ہوا۔ یہ بہادری میں اپنے باپ سے کم نہیں تھا، لیکن عزم و سیاست میں بہت پیچھے تھا۔ اپنے کو خطرات میں گھرا ہوا پا کر اس نے حریف سے صلح کرنا چاہی۔ اس حریف سے جو نجد کے ملیامیٹ کر دینے کی قسم کھا چکا تھا۔ وہ صلح کیوں کرتا؟ اور جب اس نے صلح کی بھی، تو عہد پر قائم نہ رہ

۱؎ صـ ۱۳۷ ۔ ۲؎ صـ ۱۳۹

سکا۔

آئیے، اب ہم میدانِ جنگ کی طرف پھر متوجہ ہوں۔ بحرِ احمر کے ساحل پر قنفذہ ان کے قبضہ میں آچکا تھا۔ اب محمد علی نے عابدین بیک کو ایک بڑی فوج دے کر زہران (یمن) کی طرف بھیجا۔ راستہ میں قنفذہ پر مصریوں نے قبضہ کر لیا۔ نجدیوں کو خبر ملی، تو پھر انہوں نے قنفذہ کو دوبارہ اپنے قبضہ میں کر لیا[1]۔ زہران (یمن) والی مہم میں بھی مصریوں کو زک ہوئی[2]۔ زہران کی شکست سے فیصل بن سعود کی ہمت بڑھی۔ وہ ابھی تک طائف کے قریب ڈٹا ہوا تھا۔ اب اس نے طائف پر حملہ کی ٹھانی، اور طوسون بن محمد علی کی حالت پریشان کن ہو چلی تھی کہ محمد علی کمک لے کر آگیا اور فیصل کو پھر پیچھے ہٹنا پڑا۔ طائف کے قریب بسل میں سخت معرکہ ہوا اور مصریوں کی فتح ہوئی[3]۔

"اس بسل کے معرکہ میں پانچ ہزار سے زیادہ وہابی کام آئے۔ ایک سر کی قیمت چھ ڈالر رکھی گئی تھی۔ محمد علی کے سامنے لاشوں کا ڈھیر لگ گیا۔"

"اسی معرکہ کے بعد سے وہابیوں کی قوت کمزور ہوئی۔ انہوں نے غلطی یہ کی کہ پہاڑیوں سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے۔ سعود کی وصیت تھی کہ مصریوں اور ترکوں سے کبھی کھلے میدان میں مقابلہ نہ کیا جائے[4]۔"

معرکۂ بسل کے بعد محمد علی نے جو مظالم ڈھائے، اس کی داستان انتہائی لرزہ خیز ہے۔ برک ہارٹ جو ان واقعات کا عینی شاہد ہے، ان مظالم کی انتہائی مذمت کرتا

---

[1] جمادی الاولیٰ ۱۲۲۹ھ (مئی ۱۸۱۴ء)۔ [2] شوال ۱۲۲۹ھ (ستمبر، اکتوبر ۱۸۱۴ء)۔
[3] آغاز ۱۲۳۰ھ (اواخر ۱۸۱۴ء)۔ [4] برک ہارٹ جلد ۲، ۲۱۸-۲۱۷

ہے۔ ایک معمولی واقعہ یہ ہے کہ مقتول وہابی سپاہیوں کی لاشیں کتوں کے لئے چھوڑ دی گئی تھیں[1]۔ محمد علی نے بڑھ کر تربہ پر بھی قبضہ کر لیا[2]۔

تربہ کے بعد آس پاس کے قبائل کو مطیع کرتا ہوا وہ عسیر تک پہنچ گیا اور وہاں سے قنفذہ ہو کر مکہ مکرمہ واپس ہوا۔ پھر ایک فوری ضرورت کی بنا پر اسے مصر جانا پڑا[3]۔ ابھی محمد علی عسیر کی مہم سے فارغ ہو کر تہامہ پہنچا بھی نہ ہوگا، کہ اس کا بیٹا مدینہ منورہ میں نجد پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگا۔ بڑھ کر وہ قصیم کے بعض مشہور مقامات (رس وغیرہ) پر قابض ہو گیا۔ لیکن مدینہ کے ساتھ رسل و رسائل کا تعلق نجدی جتھوں کی وجہ سے منقطع ہو گیا۔ اور پھر اُسے اپنے باپ کی خبر نہ مل سکی، جو حقیقت میں اس وقت تک مصر کے لئے رختِ سفر باندھ چکا تھا۔ محمد علی حجاز سے جیزہ (مصر) ۱۵ رجب ۱۲۳۰ھ/۲۳ جون ۱۸۱۵ء کو پہنچا[4]۔ اُدھر عبداللہ بن سعود نے اُسے گھیر لیا، اور مصری کوئی دو مہینے اسی حال میں پڑے رہے۔ مجبوراً صلح کی سلسلہ جنبانی کرنا پڑی۔

صلح اور فریب | اور فریقین کے درمیان صلح ہو گئی۔ طوسون اور عبداللہ دونوں

۱۔ برکہارٹ ص ۲۲۳؛ نیز براؤنج، ص ۹۲ ۔ ۲۔ ۴ صفر ۱۲۳۰ھ (۱۵ جنوری ۱۸۱۵ء) یہ بارو تمان کا بیان ہے۔ جبرتی (۴: ص ۲۱۱) کو فتح تربہ کی خبر مصر ۹ ربیع الاول ۱۲۳۰ھ کو پہنچی۔ برکہارٹ نے مکہ مکرمہ سے محمد علی کی روانگی کی تاریخ ۲۶ محرم ۱۲۳۰ھ (۸ جنوری ۱۸۱۵ء) بتائی ہے

۳۔ عنوان ج ۱ ص ۱۸۱ ؛ ۴۔ جبرتی ج ۴ ص ۲۲۰ ؛ برکہارٹ (ص ۳۲۹) محمد علی کے قاہرہ پہنچنے کی تاریخ ۲۵ جون ۱۸۱۵ء بتاتا ہے۔

لڑائی ختم کرنے پر متفق ہو گئے۔ (یہ بھی طے ہوا) کہ ترک (یعنی مصری) نجد اور اس کے علاقوں سے اپنا قبضہ اٹھا لیں گے۔ ترکی، شام، مصر، سے نجد آنے اور جانے والوں کے لئے پورا امن ہوگا۔ اور سب کے لئے حج کی آزادی ہوگی، اور سبھوں نے شرط نامے (رجل) لکھ دیئے۔

"اور ترک (مصری) رئیس سے پہلی شعبان کو (سنہ ۱۲۳۰ھ / ۹ر جولائی ۱۸۱۵ء) مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ عبداللہ (بن سعود) نے صلح کا خط دے کر اپنے دو آدمی (عبداللہ بن محمد بن بُنیان اور قاضی عبدالعزیز بن حمد بن ابراہیم) بھی ان کے ساتھ بھیجے، کہ وہ مصر جا کر محمد علی کے ملنے لیے پیش کریں۔ وہ لوگ مصر پہنچے اور واپس ہوئے، اور صلح مکمل ہو گئی"[1]

کہا جاتا ہے کہ اس صلح نامہ کی رو سے عبداللہ نے سلطان (قسطنطنیہ) کی ماتحتی تسلیم کر لی تھی اور کسی قریبی موقع پر "آستانہ" خلافت پر حاضری کا وعدہ بھی کر لیا[2] تھا۔ طوسوں نے بھی جواب میں نجدی علاقے کے خالی کرنے اور نجدیوں کو حج کی پوری آزادی دینے کا وعدہ کر لیا[3]"

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت عبداللہ کی حالت بہتر تھی اور تمام جنوبی علاقوں سے اس کے پاس کمک آرہی تھی۔ وہ نزاکت کو سمجھتا اور چاہتا تو مصریوں کی وقتی

---

[1] عنوان: ص ۱۸۲۔ [2] برک ہارٹ، ابن بشر اور جبرتی جیسے مستند معاصر مورخ "دار الخلافت" کی حاضری کا بالکل ذکر نہیں کرتے۔ فلبنٹ اور فلبی وغیرہ شدومد کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ — [3] فلبی ص ۹۰، فلبنٹ جلد ۲ ص ۲۵۸۔

کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کا قلع قمع کر دیتا۔ لیکن اس نے 'صلح' کر کے یہ زریں موقع کھو دیا۔ طوسون، امن و امان کے ساتھ مدینہ لوٹ گیا[۱]۔

ابن بشر اور غلبی کے مندرجہ بالا بیانات بتاتے ہیں کہ طوسون اور عبداللہ کے درمیان صلح مکمل ہو گئی تھی۔ ابن بشر تو یہاں تک کہتا ہے کہ عبداللہ کے قاصد مصر سے کامیاب واپس ہوئے[۲]۔

غلبی کہتا ہے کہ محمد علی پاشا نے یہ صلح ناپسند کی اور درعیہ کی تباہی کی دھمکی دیتے ہوئے، عبداللہ سے فوراً آستانہ پہنچنے کا مطالبہ کیا۔ "عبداللہ اپنے کو ارباب حکومت کے قدموں پر ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔ اس لئے وہ اپنے مطیع قبائل کو منظم کرنے اور اپنے پایہ تخت کے استحکام میں لگا رہا[۳]۔"

عبداللہ کے قاصد مصر میں ابن بشر اور غلبی کے علاوہ جبرتی اور دوسرے مؤرخوں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ صلح کی تکمیل محمد علی کی منظوری پر موقوف تھی۔ اور اسی غرض سے عبداللہ نے دو قاصد اس کی خدمت میں بھیجے، جو طوسون اور عبداللہ کے معاہدہ کے بعد پہلی شعبان ۱۲۳۰ھ (۹ جولائی ۱۸۱۵ء) کو مدینہ ہوتے ہوئے مصر روانہ ہو گئے۔ شوال کے آغاز میں وہ مصر پہنچے[۴] اور وہ پاشا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

"لیکن پاشا کو یہ صلح خوش نہ آئی اور اس نے آنے والوں کی خاطر مدارات

---

۱ برک ہارٹ، ص ۳۴۷ : اواخر جون ۱۸۱۵ء۔ ۲ عنوان ج ۱، ص ۱۸۳۔
۳ غلبی: ص ۹۷۔ ۴ جبرتی ج ۴، ص ۲۲۹۔

نہ کی ، بلکہ ان کے ساتھ خشونت سے پیش آیا۔[1]

اور جبرتی کے بیان کے مطابق نجدی قاصدوں نے نرمی اور عاجزی کے ساتھ گفتگو کی۔ سعود بن عبدالعزیز کی شدت اور عبداللہ بن سعود کی نرم مزاجی کا ذکر کیا۔

جبرتی ان نجدی قاصدوں (عبداللہ بن محمد بن بُنَیّان اور قاضی عبدالعزیز بن حمد بن ابراہیم) کے شوقِ علم اور حسن اخلاق کا شاندار الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔

برکہارٹ نے بھی سعود کے قاصدوں اور ان کے علم و فضل کی تعریف کی ہے ۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ علمائے مصر ان کی گفتگو و بحث سن کر مطمئن ہو گئے۔[2]

اُس وقت کے نجدیوں کے اخلاق و علم کا اندازہ کرنے کے لئے معاصر اور عینی شاہد جبرتی کی یہ رائے سننے کے لائق ہے :۔

"وہ دونوں جامع ازہر ایسے وقت گئے ، جب کوئی صاحب تدریس وہاں موجود نہ تھا ۔ انہوں نے امام احمد بن حنبل کے اہل مذہب اور فقہ حنبلی کی کتابوں کے متعلق استفسار کیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ لوگ مصر میں بالکل ختم ہو گئے ۔ اور ان دونوں نے تفسیر اور حدیث کی مختلف کتابیں (جیسے خازن ، کشاف ، بغوی ، صحاح ستہ وغیرہ) خریدیں۔ میں ان دونوں سے دو مرتبہ ملا ۔ میں نے ان میں انس ، فصاحتِ زبان ، وسعت نظر اور معلومات کی فراوانی پائی اور ان کی عاجزی ، حسن خلق ، ادب ، تفقہ اور فقہی مسائل و اختلافات پر عبور کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی ۔ ان میں سے ایک کا نام عبداللہ اور دوسرے کا عبدالعزیز ہے ، اور دوسرا

---

[1] جبرتی ج ۴ ص ۲۲۹ ۔ [2] برکہارٹ ص ۱۱۳ ۔

ہر اعتبار سے افضل تھے"۔[1]

عبداللہ بن سعود کے قاصدوں کا حال اور محمد علی پاشا کا ان کے ساتھ برتاؤ دونوں کے متعلق آپ ایک معاصر مصری مؤرخ کی زبانی سن چکے۔ تفصیل میں پڑنے کی گنجائش نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مختلف اسباب[2] کے ماتحت، جن میں مورخوں[3] کا اختلاف ہے، محمد علی نے صلح مسترد کر دی، طوسون کو جو ذیقعدہ تک حجاز ہی میں مقیم رہا[4]۔ مصر واپس بلا لیا گیا۔ اوائل ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ (نومبر ۱۸۱۵ء) میں وہ مصر پہنچ گیا۔ اور تقریباً ایک سال کے بعد دار آخرت کی راہ لی[5]۔ گو انتقال سے پہلے ہی وہ قیادت سے محروم کیا جا چکا تھا۔ مارڈ تمان کا یہ خیال صحیح نہیں، کہ طوسون کی وفات کے بعد ابراہیم کو اس مہم کا ذمہ دار بنایا گیا۔ ابراہیم کے بھیجنے کی تجویز جنوری ۱۸۱۶ء ہی میں مکمل ہو چکی تھی اور اگست ۱۸۱۶ء میں یعنی طوسون کے انتقال سے پہلے وہ قاہرہ روانہ ہو چکا تھا[6]۔ ابن بشر کے مطابق، عبداللہ بن سعود نے دوسرے سال ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) بھی، ہدایا اور تحائف کے ساتھ دو قاصد (حسن بن مزروع اور عبداللہ بن عون) محمد علی کی خدمت میں مصر بھیجے، اور اب کے ان بھولے بھالے لوگوں نے محسوس کیا کہ والی مصر اپنے عہد سے پھر گیا ہے (وجدوہ قد تغیّر)؛ حالانکہ محمد علی نے کبھی صلح کی تائید کی ہی نہیں۔ البتہ ان کے پہلے دو قاصدوں کو اس نے

---

[1] جبرتی: ج ۴ ص ۲۲۹ ۔ [2] خلاصۃ الکلام: ص ۳۰۸ ۔ [3] ملاحظہ ہو: ابن بشر ج ۱ ص ۱۸۵؛ مارڈ تمان: فلبی ص ۹۷؛ حاضر العالم الاسلامی ج ۴ ص ۱۶۶؛ [4] بلنٹ (ج ۲: ص ۲۵۸)۔ [5] ۲ ذی قعدہ ۱۲۳۱ھ (۲۹ ستمبر ۱۸۱۶ء) جبرتی ج ۴ ص ۲۶۴ ۔ [6] برک ہارٹ ص ۱۰۴ ۔

صاف جواب نہیں دیا تھا۔ اسی سے ابن بشر اور اہل نجد نے محسوس کیا کہ صلح مکمل ہو گئی اور ان کے قاصد کامیاب لوٹے (ورجعوا منہ وانتظم الصلح)[1]۔ ابن بشر[2] مزید یہ لکھتا ہے کہ محمد علی پاشا نے بعض اہل بادیہ کی "وشایت"[3] کی بنا پر صلح ختم کر دی۔ نامناسب نہ ہو گا، اگر اس سلسلے میں بعض یورپی معاصروں کی رائے بھی سن لی جائے :-

"......... اب صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ معاہدہ کی تکمیل محمد علی کی منظوری پر اٹھا رکھی گئی تھی، یا طوسون نے، جو مرتبہ (Rank) میں اپنے باپ کے برابر تھا قطعی طور پر (As a thing done) اس کی تکمیل کر دی تھی بہر حال معاملہ کچھ بھی ہو، اس نے صلح کر کے اپنا نقصان کیا۔" "محمد علی نے اسے باب عالی میں محض ایک ہنگامی صلح یا التوائے جنگ (Armistice) بنا کر پیش کیا۔"[4]

برک ہارٹ اس گفت و شنید میں عبداللہ بن سعود کی صفائی اور صاف دلی کی تعریف کرتا ہے۔ اس کے خطوط بھی برک ہارٹ[5] نے دیکھے تھے۔ برک ہارٹ اور برائیج یہ بھی کہتے ہیں کہ محمد علی نے بعد میں الحسا کے زرخیز صوبہ کا مطالبہ کیا اور اسی کے انکار پر صلح نامے کی تصدیق ملتوی رکھی۔

ابراہیم پاشا | بہر حال، حقیقت جو کچھ بھی ہو، طوسون اور عبداللہ بن سعود کے

---

۱ عنوان ج ۱ ص ۱۸۳ ۔ ۲ ایضاً ج ۱ ص ۱۸۵ ۔ ۳ چغلخوری ۔
۴ بوک ہارٹ ص ۲۵۲ ؛ برائج ص ۱۰۳ ۵ ص ۳۵۲

باہمی معاہدے سے غیر مطمئن محمد علی پاشا، والیٔ مصر نے اب نجد کی مہم کے لئے اپنے دوسرے بیٹے[1] ابراہیم پاشا کو نامزد کیا۔ تیاریاں طوسون کی واپسی کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھیں، البتہ ابراہیم پاشا کی روانگی ایک عرصہ تک ملتوی رہی، وہ ایک بڑی بھاری فوج لے کر ۶ ذی قعدہ ۱۲۳۱ھ / ۲۱ ستمبر ۱۸۱۶ء کو ینبع پہنچا اور سیدھے مدینہ کا رخ کیا اور وہاں سے چل کر حناکیہ (پانی کا چشمہ) کے پاس ٹھہرا۔ آس پاس کے بدوی قبیلے مطیع ہوئے۔ حرب، مطیر، عتیبہ اور عنزہ قبیلوں سے جوق جوق بدو اس کے جھنڈے کے نیچے مجتمع ہو گئے[2]۔ ابراہیم حناکیہ کے پاس مہینوں رہ گیا، جس کا آس پاس کے بدو قبیلوں پر کافی اثر ہوا، اور وہ ٹوٹ ٹوٹ کر ابراہیم کے پاس جانے لگے۔ عبداللہ کو اس کا احساس ہوا اور آخر اس نے پیش قدمی کی، ماویہ (پانی کا چشمہ) کے پاس مڈبھیڑ ہوئی، لیکن عبداللہ بن سعود کی فوج[3] مصری توپوں کی تاب نہ لا سکی۔ عبداللہ قصیم کی طرف پلٹا۔ ابراہیم نے بھی پیچھا کیا اور رس[4] آ کر ٹھہرا اور تین مہینے کے محاصرہ کے بعد اہل شہر نے امان طلب[5] کی۔ اس طویل محاصرہ اور مسلسل چھیڑ چھاڑ میں مصریوں کے چھ سات سو آدمی کام آئے۔ اور اہل شہر کے صرف ستر آدمی مقتول ہوئے۔ لیکن اس امان طلبی سے مصریوں کا راستہ صاف ہو گیا، اور ان

---

۱ کہا جاتا ہے کہ ابراہیم پاشا محمد علی کا لڑکا نہیں تھا۔ بلکہ محمد علی نے ابراہیم کی ماں سے نکاح کرکے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا (عنوان ج ۱ ص ۱۸۵ قلمی ص ۱۹۸ / ہوگارتھ ص ۱۰۱)۔ ۲ اواخر ۱۲۳۱ھ / نومبر ۱۸۱۶ء۔ ۳ وسط جمادی الآخرۃ ۱۲۳۲ھ / ۲ مئی ۱۸۱۷ء۔ ۴ اواخر شعبان ۱۲۳۲ھ / اوائل جولائی ۱۸۱۷ء۔ ۵ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۳۱ھ / ۲۳ اکتوبر ۱۸۱۶ء

کی پیش قدمی کو اب کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔

معمولی حملوں کے بعد عنیزہ اور رخبرا پر قبضہ ہوگیا (اواخر ۱۲۳۲ھ)۔ بریدہ پر بھی قبضہ میں وقت نہ ہوئی[۱]۔ البتہ شقراء میں نجدیوں نے دل کھول کر داد شجاعت دی۔ لیکن مصری فوج کے فرانسیسی انجینیر[۲] Vaissiere کی ترکیبوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور اہل شقراء نے بھی امان طلب کی[۳]۔

اس کے بعد ایک اور فیصلہ کن جنگ ضرمی کے قریب ہوئی۔ نجدی علاقے میں پائے تخت درعیہ کے بعد سب سے مستحکم شہر ضرمی ہی تھا۔ اس سے پہلے رس اور شقراء کے باشندے بھی بہادری سے لڑے۔ لیکن آخر امان طلب کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان دونوں کے برعکس ضرمی "عنوۃ" فتح ہوا۔ بازاروں اور گھروں میں باشندے قتل کیے گئے اور تمام مال و متاع فاتحوں نے لوٹ لیا، اور بلنٹ (جلد ۲ ص ۲۶) کے بیان کے مطابق عورتوں کی آبرو بھی ترکی سپاہ کے ہاتھوں محفوظ نہ رہی۔ ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۳۳ھ (۲۴ فروری

۱؎ محرم ۱۲۳۳ھ (نومبر ۱۸۱۷ء)۔

۲؎ ابراہیم کے ساتھ اس فرنچ انجینیر کے علاوہ چار ایطالی ڈاکٹر بھی تھے۔ ان کے نام یہ ہیں:- Scots, Gentili, Todeschini, Socio (ہوگارتھ ص ۱۰) ان میں Scots اس کا خاص طبیب تھا۔ عسیر اور یمن کی مہموں میں بھی مصری فوج میں متعدد یورپی افسر تھے (ہوگارتھ: ص ۱۲-۲۳)۔

برک ہارٹ، طوسون کی فوج کے ایک انگریز افسر Thomas Keith کی بہادری کا ذکر کرتا ہے۔ یہ اسلام لے آیا تھا اور ابراہیم آغا کے نام سے موسوم تھا۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ خود عبداللہ بھی اس کی شجاعت کا مداح و معترف تھا۔

۳؎ ۱۴ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ (۲۲ جنوری ۱۸۱۸ء) بلنٹ: ج ۲ ص ۲۶۰

۱۸۱۸ء کو ضرمی میں مصریوں کا داخلہ ہوا، یہ گویا نجدی حکومت کے زوال کا اعلان تھا۔
سعود بن عبداللہ بن محمد بن سعود اور اس کے ساتھ کچھ درعیہ کے جاں نثار شہر کے ایک قصر میں قلعہ بند ہو گئے۔ آخر انہیں بھی امان دی گئی؛ اور وہ لوگ درعیہ چلے گئے ان کے ساتھ اہل شقراء کے تین ہزار سے اوپر بچے اور عورتیں بھی تھیں۔ ان سب کو امیر عبداللہ بن سعود بن عبدالعزیز نے درعیہ میں پناہ دی[۱]۔

سقوط درعیہ اب ابراہیم پاشا درعیہ کے سامنے تھا، جہاں وہ چھ ماہ تک محاصرہ کیے پڑا رہا۔ روزانہ جنگ ہوتی، اور مصری بڑی تعداد میں کام آتے؛ لیکن وہاں آئے دن مصر سے تازہ دم کمک آتی رہتی اور یہاں درعیہ والوں کی تعداد روز کم ہوتی جاتی۔ رسد اور اسلحہ کی کمی الگ انہیں ستاتی تھی۔ امیر عبداللہ بن سعود، اس کے اہل خاندان اور شیخ الاسلام کے بیٹے پوتے، سب بلا استثناء جی کھول کر لڑے۔ آخر اہل شہر نے صلح و امان طلب کی[۲]۔ عبداللہ بن سعود کو اب بھی ہتھیار ڈالنے میں پس و پیش تھا۔ شہر کے اندر اپنے خاندانی قلعہ (طُریف) میں پناہ گزیں ہو کر لڑنے لگا، لیکن قلعہ کی دیواریں بے کار ہو چکی تھیں اور اب مدافعت بے کار تھی۔ آخر اس نے اپنے کو ابراہیم کے سپرد کر دیا[۳]۔ اور یہ پہلی سعودی حکومت، اور فلبی کی زبان میں "فرسٹ وہابی امپائر" (جس کی تعمیر میں شیخ رح اور ان کے ہم جلیسوں کا بڑا ہاتھ تھا) کے خاتمہ کا اعلان تھا۔

عبداللہ بن سعود کا حشر صلح کے دو روز بعد عبداللہ بن سعود کو سفر کا حکم دیا گیا۔ تین چار آدمی اس کے اپنے بھی ساتھ رہے۔ امیر نجد کا قافلہ محرم ۱۲۳۴ھ (نومبر ۱۸۱۸ء)

۱؎ عنوان ج ۱ ص ۱۹۳۔ ۲؎ ۸ ذی قعدہ ۱۲۳۳ھ (۹ ستمبر ۱۸۱۸ء) عنوان ج ۱ ص ۲۰۶؛ ہارڈمان نے سقوط درعیہ کی تاریخ ۹ ستمبر ۱۸۱۸ء دی ہے۔ ۳؎ ۹ ستمبر ۱۸۱۸ء؛ ہارڈمان؛ فلبی ص ۱۰۲۔

کے اوائل میں مصر پہنچا۔ اس کا داخلہ نہایت مضحکہ انگیز صورت میں ہوا۔ بیچارے کو مصریوں نے تماشا بنا لیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ایک شکست خوردہ والی مملکت کے ساتھ جو کچھ بدسلوکی روا رکھی جا سکتی تھی، اس میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔[1] محمد علی کی خدمت میں وہ حاضر ہوا۔ کچھ ضابطہ کی باتیں ہوئیں، اور ۱۹ر محرم کو اسے اسکندریہ اور وہاں سے آستانہ بھیج دیا گیا، جہاں موت اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ۱۷ر دسمبر[2] ۱۸۱۸ء (۸ر صفر ۱۲۳۴ھ) کو وہ اور اس کے ساتھی، ایا صوفیا کے صحن میں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیئے گئے۔ (اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون)۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ دار الخلافت میں بھی ان مقہورانِ بلا کو بری طرح گشت کرایا گیا۔

عبد اللہ بن سعود بن عبد العزیز بن محمد بن سعود کے ساتھ امراءِ نجد کا وہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، جو براہِ راست شیخ رح سے مستفید ہوا تھا۔ عبد العزیز بن محمد بن سعود اور سعود بن عبد العزیز تو شیخ رح کے باضابطہ شاگرد تھے۔ عبد اللہ بن سعود کی عمر شیخ الاسلام کی وفات (۱۲۰۶ھ) کے وقت کم رہی ہوگی، اس لئے ممکن ہے کہ وہ باضابطہ ان کے درس سے نہ مستفید ہوا ہو، پر اتنا یقینی ہے کہ اس نے شیخ الاسلام کا زمانہ پایا تھا۔

عبد اللہ کو اطمینان سے حکومت کا موقع بالکل ہی نہیں ملا، پھر بھی درس و تبلیغ نیز انتظام حکومت میں وہ بالکل اپنے باپ اور دادا کے نقش قدم پر رہا اور اس سلسلہ میں کوئی نئی بات قابل ذکر نہیں۔[3]

---

[1] جبرتی ج ۱ ص ۲۹۵؛ خلاصۃ الکلام: ص ۳۰۲۔ [2] ماردتمان نے پھانسی کی تاریخ ۱۹ر دسمبر لکھی ہے۔ ابن بشر اور جبرتی نے تاریخ کی تعیین نہیں کی۔ [3] عنوان ج ۱ ص ۲۰۹)

باقی لوگوں کا انجام درعیہ کے اندر اور باہر مسلسل چھ مہینے لڑائی ہوتی رہی۔ ان معرکوں کی تفصیل، اس کتاب کی محدود گنجائش اور اس کے موضوع بحث سے خارج ہے۔ ان واقعات کے معاصر اور شاہد ابن بشر نے پوری تفصیل دی ہے۔ بلکہ شہر کے مختلف مورچوں اور ان کے جائے وقوع کی بھی کافی توضیح کی ہے[1]۔

اس لڑائی میں صرف آل سعود کے اکیس[۲۱] افراد شہید ہوئے۔ ان میں سے ممتاز اشخاص کے نام یہ ہیں فیصل[۱] بن سعود، ابراہیم[۲] بن سعود، فہد[۳] بن عبداللہ بن عبدالعزیز فہد[۴] بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود، محمد[۵] بن حسن بن مشاری بن سعود، ابراہیم[۶] بن حسن بن مشاری، عبدالرحمان[۷] بن حسن بن مشاری، عبداللہ[۸] بن ابراہیم بن حسن بن مشاری، ابراہیم[۹] بن عبداللہ بن فرحان، عبداللہ[۱۰] بن ناصر بن مشاری، محمد[۱۱] بن عبداللہ بن محمد بن سعود، سعود[۱۲] بن عبداللہ بن محمد بن سعود، عبداللہ[۱۳] بن حسن بن مشاری، محمد[۱۴] بن سعود بن عبداللہ بن محمد بن سعود اور آل الشیخ[2] میں سے مندرجہ ذیل اشخاص شہید کئے گئے:۔

سلیمان[۱] بن عبداللہ بن الشیخ، علی[۲] بن عبداللہ الشیخ، محمد[۳] بن عبدالرحمان بن حسن بن الشیخ۔ ان میں سے سلیمان بن عبداللہ کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور پورے جسم کی تکا بوٹی کی گئی۔ اللہ رے جوشِ انتقام!!

آل سعود اور آل الشیخ کے علاوہ مندرجہ ذیل علماء اور اعیان شہید ہوئے۔ ان میں سے بعض میدان جنگ میں کام آئے اور اکثر سنگینوں، بندوقوں اور مختلف قسم کی اذیتوں کا شکار ہوئے:۔

---

[1] عنوان المجد ج ۱ ص ۲۰۸ - ۱۹۲   [2] عنوان ج ۱ ص ۲۱۱ ۔

علی بن محمد بن راشد عرینی، قاضی خرج؛ صالح بن رشید الحربی۔ عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ بن سویلم، احمد بن عیسٰی بن سویلم، محمد بن ابراہیم بن سدحان[1]۔

ان مقتولین کے علاوہ بعض مشہور اہل علم کے ساتھ ابراہیم پاشا انتہائی بدتمیزی سے پیش آیا۔ قاضی احمد بن رشید الحنبلی مدینہ کے مشہور عالم امیر عبد اللہ کے ہاں مقیم تھے، زدوکوب سے ان کی تواضع کی گئی اور تمام دانت اکھاڑ ڈالے گئے[2]۔

یہ قاضی احمد بن رشید، جن کا پورا نام احمد بن حسن بن رشید ہے، احساء کے رہنے والے اور فقہ حنبلی کے مشہور عالم تھے۔ عام طور پر 'الحنبلی' کے نام سے شہرت تھی۔ پہلے یہ شیخ کی دعوت کے مخالف تھے، پھر مؤید ہو گئے۔ مدینۃ الرسول کا جوار پسند آگیا تھا، وہیں متوطن ہو گئے تھے، بڑی عمر پائی اور وہیں وفات[3] پائی۔

'السحب الوابلۃ' (ص ۳۵-۴۳) میں ان کا مفصل ذکر ہے لیکن ان کے قبول دعوت کی السحب کے مصنف نے عجیب و غریب تاویلیں کی ہیں۔

اسی سلسلے میں شیخ عبد العزیز الحصین ناصری (ف ۱۲۳۷ھ) جیسے کبیر السن عالم اور بزرگ کے ساتھ بدسلوکی کا قصہ بھی آتا ہے۔ فتح شقرا کے وقت شیخ عبد العزیز الحصین بھی وہاں تھے۔ ابراہیم پاشا نے انہیں اپنی مجلس میں بلوایا، کبیر سنی کی وجہ سے وہ خود نہ آسکتے تھے، مجبوراً لوگ انہیں اٹھا کر لائے (محمولاً)۔

انہوں نے آتے ہی مسنون طریقہ پر:

'سلامٌ علیک یا ابراہیم'

---

[1] عنوان ج ۱ ص ۲۰۰۔ [2] ایضاً۔ [3] ۱۲۴۹ھ۔

کہا۔ مصری پاشا کی پرغرور پیشانی پر شکن پڑ گئی۔ اور وہ شیخ عبدالعزیز کا تمسخر کرنے لگا۔ شیخ نے نصیحت شروع کی، اور عفوؔ کی چند آتیں پڑھیں۔ تو پاشا نے کہا: "جا، بڈھے میں نے تیرا قصور معاف کیا۔"[1]

یہ وہی شیخ عبدالعزیزؒ ہیں، جو شیخؒ کے خاص شاگرد تھے، اور خود ان کی زندگی میں دو مرتبہ (۱۱۸۵ھ۔ ۱۲۰۴ھ) 'وفد' کی حیثیت سے حجاز بھیجے گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (پہلا باب)۔

اس دار و گیر سے جو خوش نصیب بچ کر نکل سکے، ان میں ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود (جس کے ہاتھ آگے چل کر نجدی حکومت کی تجدید ہوئی) اور شیخ علی بن حسین بن شیخ الاسلام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آل سعود کے بعض افراد اس وقت تو بچ کر نکل گئے، اور جب پھر وہ درعیہ لوٹے، تو مصری حاکم نے انہیں پکڑا کر مصر بھیج دیا۔ ان کے علاوہ آل سعود اور آل الشیخ کے باقی ماندہ افراد مع اہل و عیال کے مصر بھیج دیئے گئے۔ جہاں یہ غریب الوطن عرصہ تک مقیم رہے۔ بعض نے ہیں لقمۂ اجل بنے، اور اکثر حالات سازگار ہونے پر اپنے وطن کو واپس ہوئے۔[2] غریب الوطنوں کا یہ قافلہ ۱۸ رجب ۱۲۳۴ھ (۱۳ مئی ۱۸۱۹ء) کو مصر پہنچا، ان کی

---

[1] عنوان المجد، ص ۱۹۱۔ طبع ۱۳۴۶ھ؛ خلاصۃ الکلام، ص ۳۰۳۔

[2] ان ہی واپس ہونے والوں میں نجد کے دو مشہور عالم شیخ عبدالرحمان بن حسن بن شیخ الاسلام اور ان کے صاحبزادے شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمان بن حسن بھی تھے، جن کا ذکر اس کتاب کے پہلے باب میں آچکا ہے۔ ملاحظہ ہو (ص ۵۶-۵۷)۔

تعداد عورت، مرد اور بچوں کو ملا کر چار سو کے قریب تھی (جبرتی ج ۴ ص ۳۰۲)

درعیہ کی بربادی درعیہ پر قبضہ ذی قعدہ ۱۲۳۳ھ کے اوائل میں ہوا، لیکن اس کی تباہی و بربادی کا سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ خود ابراہیم پاشا کوئی نو مہینے وہاں رک گیا۔ روز نیا حکم جاری ہوتا اور اس کی پابندی کرائی جاتی جب تمام مرحلے طے ہو گئے، تو پھر آخر میں ایک ایسی ضرب لگائی گئی۔ جس سے آل سعود کا یہ پہلا پایہ تخت پھر نہ پنپ سکا۔

شعبان ۱۲۳۴ھ (جون ۱۸۱۹ء) میں محمد علی پاشا کا حکم پہنچا اور اس کے مطابق لائق بیٹے (ابراہیم) نے درعیہ کی بربادی کا حکم دیا۔ پھر کیا تھا:

"مصری فوج نے سارا شہر کھود کر پھینک دیا۔ تمام باغ و نخلستان جڑ سے کاٹ ڈالے۔ بوڑھے بچے کمزور اور بیمار سب یکساں عتاب کا شکار ہوئے۔ گھروں میں آگ لگا دی گئی اور چند روز میں لہلہاتا ہوا باغ جل کر خاک بھسم ہو گیا۔"[1]

یہ مصریوں کے جنونِ انتقام کا سب سے بدترین مظاہرہ تھا۔ یہ وہ درعیہ ہے، جو شیخ کی دعوت سے پہلے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ شیخ کی دعوت نے اسے مرکزیت بخشی اور آل سعود کی کوششوں اور حوصلہ افزائیوں سے تھوڑے عرصہ میں ایک آباد اور خوش حال شہر بن گیا۔ ابن بشر درعیہ کی خوش حالی، رونق اور تجارتی مرکزیت کا شاندار لفظوں میں ذکر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کے اپنے چشم دید تاثرات خاص اہمیت رکھتے ہیں[2]۔

---

[1] عنوان المجد ج ۱ ص ۲۱۳؛ تاریخ نجد (آلوسی) ص ۲۴-۲۶۔ [2] عنوان ج ۱ ص ۲۱۴۔

سرکار برطانیہ کی مبارک باد اور امداد کی پیش کش

درعیہ کو خاک سیاہ کرنے کے بعد ابراہیم نجد کے علاقے سے واپس ہُوا چاہتا تھا کہ سرکار برطانیہ کے ہندوستانی افسروں کو ایک عجیب تجویز سوجھی۔ انہوں نے ابراہیم کو مبارک باد دینے کے لئے ایک خاص وفد کپتان جارج فارسٹر سیڈلیر George Sadlier Forester کی ماتحتی میں روانہ کیا۔

اس مبارک باد کی تہ میں جو جذبہ کام کر رہا تھا اس کے سمجھنے کے لئے یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ کمپنی کی حکومت خلیج فارس کے ساحل پر اپنا اثر و اقتدار بڑھانے کے لئے عرصہ سے کوشاں تھی۔ نجدی اقتدار ساحل[1] پر بڑھا، تو بحری تاخت کی رفتار تیز ہو گئی اور تجارتی جہازوں کو نقصان پہنچنے لگا۔ اس بحری قزاقی Piracy کا خاتمہ کرنے کے لئے حکومت بمبئی نے ۱۲۲۴ھ ۱۸۰۹ء میں قرصان کے مرکز راس الخیمہ پر حملہ کیا اور اسے جلا کر خاک سیاہ کر دیا، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

اب جو کمپنی کی حکومت کو مصری فتوحات اور نجدیوں کی تباہی کی خبر ملی، تو اس کے دل میں خدشہ پیدا ہُوا کہ کہیں اس نئی طاقت کے ہاتھوں بھی اس کے اقتدار کو صدمہ نہ پہنچے۔ درعیہ کے قبضہ کے ساتھ ہی کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن

---

[1] یہاں پر یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ساحل پر نجدی اثر بڑھتے ہی برطانی افسروں نے نجدیوں سے بھی خلا ملا پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ بصرہ کے برطانی ریزیڈنٹ منیستی Manesty نے ۱۷۹۹ء میں Reinand کو خاص اسی غرض سے درعیہ بھیجا تھا، اور اس وقت اسے عارضی کامیابی بھی ہو گئی تھی۔ ہوگارتھ (حاشیہ ص۱۰۴)

سے ان کا اندیشہ قوی ہو گیا۔ مصری فوجی دستے خلیج فارس کے ساحلی علاقوں پر تگ و تاز کرنے لگے۔ اور اس میں انہوں نے برطانوی حلقۂ نفوذ و اثر کا احترام بھی ملحوظ نہیں رکھا۔ برطانی افسر اپنے نجدی حریفوں کی بربادی پر تو بہت خوش تھے لیکن مصریوں کے ہاتھوں اس تاراج و برتاؤ کے لئے بھی تیار نہیں تھے[1] فوراً کپتان ج۔ ف۔ سیڈلیر کو ابراہیم پاشا کی خدمت میں درعیہ بھیجا گیا۔ اصل میں برطانی افسروں کو مصریوں کے غرض و غایت کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی یہ خلیج فارس تو کجا مصری نجد پر بھی دائمی قبضہ یا حکومت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ درعیہ کی فتح کے ترنگ میں، ممکن ہے، انہوں نے آس پاس کے علاقوں پر دستے بھیجے ہوں، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ پائدار اور منظم حکومت قائم کرنے کا ارادہ انہوں نے کبھی نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ابراہیم پاشا درعیہ کو تباہ کرنے کے بعد سارے علاقے کو عام ابتری کی حالت میں چھوڑ کر مصر روانہ ہو گیا۔

خیر اب آئیے، ذرا سیڈلیر کے مشن کی سرگزشت ایک واقف کار کی زبانی سنئے:۔

"مصریوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ، کسی طرح کا مشورہ کئے بغیر، بمبئی سے ۱۸۱۹ء (۱۲۳۴ھ) کے موسم گرما میں، ایک برطانی جنگی جہاز خلیج کی طرف بھیجا گیا۔ اس پر سرکار (His Majesty) کی سینتالیسویں (Forty Seventh) رجمنٹ کا افسر، کپتان ج۔ ف۔ سیڈلیر بھی ایک خاص قاصد (Emissary) کی حیثیت سے ساتھ تھا۔ اس کی مہم کا مقصد ابراہیم کو درعیہ کے زیر کرنے پر مبارکباد دینا" اور "پاشا His Excellency

---

[1] فیلبی ص۱۰۳

ے مل کر وہابی طاقت کے مکمل استیصال کا مناسب انتظام کرنا تھا۔"

اس افسر کے ہدایت نامے کے مزید فقرے یہ ہیں:

"اگر، جیسا کہ غالباً صورت حال ہو، پاشا، برطانی حکومت کی امداد سے فائدہ اٹھانا چاہیے تو ایک مکمل اور مضبوط بحری فوجی طاقت جلد از جلد بھیجی جائے گی، اور "ترکوں" [مصریوں] کو راس الخیمہ پر قبضہ دلایا جائے گا....." الخ

"لیکن تاریخ میں بہت کم خفیہ مشن ایسے ناکام ہوئے ہوں گے، جیسا کہ سیڈلیر مشن کی قسمت میں لکھا تھا۔"

تفصیل[1] بہت لمبی ہے۔ خلاصہ یہ کہ سیڈلیر عرب کے ساحل پر اس وقت اترا جب ابراہیم درعیہ کی بربادی سے سیر ہو کر وطن کی واپسی کا ارادہ کر رہا تھا۔ بتانے والوں نے اسے بتایا کہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے ملاقات کس مقام پر ہو سکے گی؟ یہ ۲۸ جون ۱۸۱۹ء کو روانہ ہوا۔ درعیہ کے پاس سے گزرتا ہوا شقرا پہنچا۔ وہاں سے رس آیا۔ یہاں اسے ابراہیم کی فوج تو ملی، لیکن خود پاشا، مدینہ کے لئے رخت سفر باندھ چکا تھا۔ ابراہیم کو اس کی آمد کی اطلاع تھی لیکن وہ کوئی ایسا ملنے کا مشتاق نہیں تھا، کہ اس کا انتظار کرتا۔ آخر مدینہ کے قریب پاشا کی خدمت میں ۸ اور ۹ ستمبر کو باریابی ہوئی۔ پاشا نے گفتگو تو اخلاق سے کی، لیکن کسی قسم کا وعدہ نہیں کیا۔ اور برطانی قاصد ناکام واپس آیا۔ البتہ اس نے اس تین مہینے کی بادیہ گردی سے ایک بڑا امتیاز حاصل کر لیا۔ یہ پہلا یورپی تھا جس نے جزیرۃ العرب کو ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک عبور کر لیا

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ہوگارتھ کی **Penetration of Arabia** ص ۱۰۴-۱۱۱

درعیہ مصریوں کے ہاتھوں ایسا برباد ہوا کہ پھر نہ آباد ہو سکا۔ یہ تباہی ایسی حوصلہ شکن تھی، کہ ایک عرصہ تک نجدیوں کے پنپنے کی کوئی امید نہیں دکھائی دیتی تھی۔ بلنٹ[1] جیسے وسیع النظر اور بظاہر عربوں کے ہمدرد مدبر نے ۱۸۸۱ء میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔

"عرب میں سعودی خاندان کے اقتدار کو اب قصہ ماضی سمجھنا چاہیئے"

ڈاوتی[2] (Daughty) ۱۸۷۵ء میں اہل نجد کی عام رائے نقل کرتا ہے:

"اب وہابی حکومت دوبارہ زندہ نہیں ہونے کی۔ کم از کم نجد میں یہی خیال کیا جاتا ہے"۔

اور زویمر[3] جیسے دشمن اسلام نے ۱۹۰۱ء میں یہ رائے ظاہر کی۔

"اس تحریک کا خاتمہ انتہائی ناکامی پر ہوا اور سیاسی طور پر یہ ایک شاندار ڈھونگ ثابت ہوئی"۔

دوسری جگہ یہی دشمن اسلام در عرب لکھتا ہے:

"عرب میں سعودی خاندان کے اقتدار کو اب قصہ ماضی سمجھنا چاہیئے"۔

لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ جزیرۃ العرب کی امانت پھر انہیں نجدیوں کو ملی، اور پہلے سے زیادہ وسعت و اقتدار کے ساتھ۔ ہاں درعیہ پھر نہ بن سکا۔ نجدی حکومت

---

[1] ج:۲: ص ۲۶۸ ۔ [2] ج ۲: ص ۲۵۴

[3] ص ۱۲ مگہ بحوالہ نقلی ص ۱۰۲؛ خلیلی ص ۱۶۰) کو حیرت ہے کہ زویمر کا یہ ریمارک اس کی کتاب کے ۱۹۱۲ء کے ایڈیشن میں بھی اسی طرح قائم ہے۔ حالانکہ موجودہ سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمان بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود ۱۹۰۲ء میں ریاض پر قابض ہو چکا تھا۔ یہاں پر یہ ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ ہوگارتھ (ص ۳۰) نے ۱۹۰۵ء میں اس تحریک کے پنپنے، اور دوبارہ بڑھنے کی توقع ظاہر کی تھی۔ گو ریاض پر دوبارہ قبضہ کے بعد یہ پیشین گوئی کوئی ایسی قابل تعریف بھی نہیں۔ البتہ زویمر کا جہل حیرت انگیز ہے۔

کی تجدید اور تشکیل درعیہ میں نہیں بلکہ اسی علاقے کے دوسرے مقام ریاض میں ہوئی۔ اور اب وہی ان کا پایہ تخت ہے۔

درعیہ کا مرثیہ | درعیہ کے جاں گداز فاجعہ کا اہل نجد اور ان کے ہمدردوں پر جو کچھ اثر ہوا ہوگا، اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ رونے والے اپنے اپنے تعدد اور ظرف کے مطابق خون کے آنسو روئے ہوں گے۔ ہم ذیل میں صرف ایک مرثیہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مرثیہ نجد کے مشہور عالم حمد بن ناصر بن معمر (ف ۱۲۲۵ھ) شاگرد شیخ الاسلام، کے بیٹے عبدالعزیز[1] بن حمد بن ناصر (ف ۱۲۴۴ھ) کا لکھا ہوا ہے، گو اس میں شریف رندی کے مرثیہ سقوط طلیطلہ[2] یا سعدی کے نوحہ بغداد[3]

---

[1] عبدالعزیز بن حمد بن ناصر کا شمار نجد کے ممتاز علماء میں تھا۔ اپنے والد ماجد حمد بن ناصر بن معمر (ف ۱۲۲۵ھ) اور شیخ کے دوسرے شاگردوں سے استفادہ کیا۔ عیسائیوں کے رد میں ان کی ایک قابل قدر تصنیف (منحۃ القریب المجیب فی الرد علی عباد الصلیب) اس وقت ہمارے سامنے ہے جو مصر میں شاندار طریقے پر طبع ہوئی ہے۔

[2] ابو البقاء صالح بن شریف رندی کا مشہور مرثیہ جس کا مطلع یہ ہے:۔

لِکُلِّ شیءٍ إذا ما تَمَّ نقصانُ   فلا یُغَرَّ بطیبِ العیشِ انسانُ

طلیطلہ کا سقوط صفر ۴۷۸ھ میں ہوا۔ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ سقوط غرناطہ (۸۹۲ھ) کا مرثیہ ہے مگر صحیح یہی ہے کہ یہ سقوط غرناطہ سے تین سو برس پہلے کہا گیا تھا (نفح الطیب ج ۲ ص ۵۹۴)

[3] زوال بغداد (۶۵۶ھ) کا مرثیہ جس کا مشہور مطلع یہ ہے:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم، امیر المومنیں

کا سوز و گداز اور زور نہیں ہے، پھر بھی اس میں درد ہے اور ایک دیندار قوم کے صبر و شکر کا آئینہ۔ مرثیہ کا مطلع[1] یوں ہے:-

الیك الله العرش اشكو تضرعا ۔ وادعوك فی ضراء ربی لتسمعا

نمونہ کے طور پر دو چار شعر اور درج ہیں:

وكم قتلوا من عصبة الحق فتية ۔ هداة وضاة ساجدين وركعا

وكم دمروا من مربع كان اهلا ۔ فقد تركوا الدار انيسة بلقعا

مضوا وانقضت ايامهم حين اوردوا ۔ ثناء وذكرا طيبة قد تضوعا

فجازاهم الله الكريم بفضله ۔ جنانا ورضوانا من الله ارفعا

الا ايها الاخوان صبرا فاننى ۔ ارى الصبر للمقدور خيرا وانفعا

ولا تيأسوا من كشف ما نأب انه ۔ اذا شاء ربى كشف ذاك تزعزعا

درعیہ کی تباہی کے سانحہ (۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء) شیخ کے تربیت کردہ اور اصلاح یافتہ نجد کی سیاسی برتری ختم ہو جاتی ہے۔ نجد جدید[2] اور اس کی ترقی ہمارے دائرہ بحث سے خارج

---

[1] عنوان ج ۲، ص ۳۴ ۔ [2] نجد کی تاریخ کے تین دور ہو سکتے ہیں: (الف) درعیہ کی سربلندی سے لے کر ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء تک جب کہ مصریوں کے حملوں اور درعیہ کی تباہی کے باعث ان کی قوت تتر بتر ہو گئی۔

(ب) ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود (۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۰ء تا ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء) اور فیصل بن ترکی (م ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء۔ ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء اور ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء تا ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء) کی بازیابی کی کوششوں سے شروع ہو کر ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء تک جب کہ محمد بن عبداللہ آل الرشید (۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء۔ ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء) امیر حائل نے حائل اور ریاض

ہے۔ اس لئے نجدی حکومتوں کا قصہ چھوڑ کر ہمیں اب شیخ اور ان کی تصنیفات کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

ہاں اس سلسلے میں نجدی اور مصری لشکر کا باہمی فرق اور محمد علی اور ابراہیم پاشا کے مزاج و اخلاق کے متعلق بھی دو حرف عرض کر دیا جائے، تو شاید نامناسب نہ ہو۔

مصری فاتح

مصریوں اور نجدیوں کے درمیان عرصہ تک جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہا۔ شروع شروع مصریوں کو کافی زک اُٹھانا پڑی، لیکن نجدیوں نے اسلامی قانون جنگ کی خلاف ورزی کبھی نہیں کی اور ان کی سپاہ کی شدت اور تقشف کے متعلق جو کچھ کہا جائے، پر اخلاقی کمزوریوں اور فسق و فجور کی مثالیں نہیں پیش کی جا سکتیں۔ رہے محمد علی اور ابراہیم اور ان کے ساتھی، تو ان کے رویہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں "اسلامیت" چھو بھی نہیں گئی تھی۔ اور پتہ چلتا ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں عام طور پر مسلمان انحطاط کی کس حد تک پہنچ چکے تھے۔

نجدی اور مصری فوجوں کا باہمی فرق معلوم کرنے کے لئے، مشہور معاصر مصری مورخ جبرتی کا مندرجہ ذیل بیان کافی ہوگا۔ محرم سنہ ۱۲۲۷ھ کے حوادث میں مصریوں کی شکست سے بحث کرتے ہوئے، ایک مصری فوجی افسر (لقد قال لی بعض اکابرھم) کی زبانی

(بقیہ حاشیہ صـ ۱۲۵) نجد کی دونوں ریاستوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے مجتمع کر لیا۔

(ج) تیسرا زرین دور (فلبی کی زبان میں "سکنڈ وہابی امپائر") سنہ ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء سے شروع ہوتا ہے، جب کہ عبد العزیز بن عبد الرحمان بن فیصل بن ترکی بن عبد اللہ بن محمد بن سعود نے آل الرشید سے ریاض واپس لے لیا۔

لکھتا ہے:

"ہمیں فتح کیسے نصیب ہو؟ ہماری فوج کا بڑا حصہ بے دین ہے۔ کسی آئین کی پابندی نہیں۔ بکس کے بکس مسکرات سے بھرے ہوئے ساتھ ہیں۔ ہماری چھاؤنی میں اذان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ان کے دلوں میں دین اور شعائر دین کا خیال بھی نہیں آتا۔ اور یہ قوم (یعنی نجدی ——— عربی تعبیر "دوالقوم" ہے) وقت ہوتے ہی اذان دیتی ہے اور ایک امام کے پیچھے خشوع اور خضوع کے ساتھ صف بندی کرتی ہے۔ اگر جنگ کے دوران میں کہیں نماز کا وقت آگیا، تو موذن اذان دیتا ہے اور سب 'صلوٰۃ خوف' ادا کرتے ہیں۔ ایک جماعت جنگ کے لئے آگے بڑھتی ہے۔ پھر دوسرا گروہ نماز کے لئے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور ہماری فوج حیرت سے منہ تاکتی ہے۔ ان بے چاروں نے دیکھنا تو درکنار، سنا بھی نہیں[1]۔"

ہم اپنے قلم کو ان برائیوں کے تذکرے سے آلودہ کرنا نہیں چاہتے، جو اس مصری فوجی افسر کے بیان کے مطابق مصری فوج نے بدر اور اس کے نواح میں روا رکھی تھیں۔ اتنا اشارہ کر دینا کافی ہوگا، کہ اہل علم اور شرفاء کے گھروں کی بھی آبرو برقرار نہیں رہی تھی[2]۔

یہ تو ایک فوجی افسر کا بیان تھا۔ جبرتی کی اپنی روایت بھی ملاحظہ ہو۔ رمضان ۱۲۳۳ھ کے حوادث میں لکھتا ہے:-

---

۱؎ جبرتی، ج ۴ ص ۱۴۰۔ ۲؎ ایضاً۔

"خشکی اور سمندر کی راہ سے فوجیں تین دفعات میں آگئے پیچھے شعبان اور رمضان کے مہینوں میں روانہ ہوئیں ...... اور ان لوگوں نے سفر کا عذر کر کے روزے نہیں رکھے ان کی بڑی تعداد بازاروں میں بیٹھ کر کھاتی پیتی ہے (یہ لوگ) ۔ ہاتھوں میں تمباکو کا ناریل لئے ہوئے بے شرمی کے ساتھ سڑکوں پر گھومتے رہتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام کے مخالفوں اور کفار سے جہاد اور غزوہ کے لئے جارہے ہیں[1]"

جب دین اور دینی نظام کے احترام کا یہ عالم تھا، تو پھر درعیہ کی بربادی اور نجد پر قبضہ کے بعد ابراہیم پاشا کا دماغ پھر گیا، تو اس پر تعجب کیوں ہو؟ جبرتی فاتح نجد کی انانیت اور تکبر کا شاکی ہے ۔

"اس "غیبت" (یعنی اتنے دنوں جنگ کے سلسلے میں باہر رہنے) کے بعد ابراہیم پاشا اپنے کو بہت بڑا سمجھنے لگا ہے اور اس کے غرور کی کوئی حد نہیں رہی، حتی کہ جب علماء (مشائخ) اس کے پاس سلام کرنے اور تشریف آوری پر مبارکباد دینے گئے تو وہ ان کی تعظیم کے لئے کھڑا نہیں ہوا اور ان کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا ۔ آخر وہ لوگ بیٹھ گئے اور خیر و عافیت پر مبارکباد پیش کرنے لگے ! تو اس نے اشارہ سے بھی جواب نہیں دیا، بلکہ ایک دوسرے شخص سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا رہا ۔ وہ بیچارے رنجیدہ ہو کر لوٹ گئے[2]"

---

[1] ۴ : ۲۰۶ ۔ [2] ایضاً ج : ۴ ؛ ص ۳۰۶ ؛ جبرتی کے علاوہ ہوگارتھ (ص ۱۰۱) نے بھی ابراہیم پاشا کی "سیرت" کا نہایت اچھا خاکہ کھینچا ہے ۔

کیا اس پر کسی اظہار رائے کی ضرورت ہے؟

محمد علی کی مکاری اور مظالم | محمد علی پاشا کے مظالم کو ہم یہاں دہرانا نہیں چاہتے۔ برک ہارٹ (جس نے محمد علی کے عہد حکومت میں حجاز اور جزیرہ عرب کی سیاحت کی تھی اور جسے وہابیوں کے ساتھ کوئی خاص ہمدردی بھی نہیں) نے اس کے مظالم کی مفصل داستان لکھی ہے[1] جو مستند اور قابل وثوق ہے۔ بعض مبصر ابراہیم کے غدر اور مکر و فریب کی بھی ساری ذمہ داریاں محمد علی ہی کے سر ڈالتے ہیں:

"جس بے رحمی اور دغابازی کا برتاؤ معزول بادشاہ اور عام وہابیوں کے ساتھ کیا گیا، اس کا الزام بھی ابراہیم سے زیادہ محمد علی کے سر عائد ہوتا ہے"[2]

برک ہارٹ محمد علی کی 'رشوت ستانی' کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق بدوؤں کو رشوتیں دے کر محمد علی نے کامیابی حاصل کی:-

"مصریوں کی طرف بدوؤں کی ہمدردی مبذول کرنے میں رشوت کا بہت دخل تھا۔"

اس نے محمد علی کے مظالم اور بے رحمانہ قتل کی بھی کافی مثالیں دی ہیں۔ یہی سیاح ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:-

"محمد علی نے اپنے سپاہیوں کی طاقت سے زیادہ، روپے کے ذریعہ عرب پر اپنی دھاک بٹھائی"[3]

---

[1] برک ہارٹ: ۳۵۲، ۳۲۳، ۳۱۷، ۳۰۸، ۲۴۲۔ [2] ہوگارتھ: ص ۱۰۳
[3] ص ۲۰۶-۲۰۷۔

ان کے مقابلہ میں نجدی وہابیوں کے بارے میں ایک عینی شاہد (مشہور اسپینی سیاح بیدیا Badia عرف علی بے عباسی کا بیان سنئے، جو نجدیوں کے قبضہ کے وقت مکہ مکرمہ میں موجود تھا:

"جب تک وہ یہ نہ جان لیں کہ فلاں چیز دشمن یا مشرک کی ہے، اسے ہاتھ نہیں لگاتے اور زبردستی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ تمام چیزیں قیمت دے کر خریدتے ہیں۔ اسی طرح ہر "خدمت" کی اجرت ادا کرتے ہیں۔ اپنے سردار کے اندھے اطاعت شعار ہونے کی وجہ سے، اس کے احکام کی تعمیل میں ہر مشقت برداشت کرنے کو تیار رہتے ہیں"[1]

علی بے سے بھی زیادہ محقق سیاح برک ہارٹ جو ۱۹۱۴ء میں (یعنی محمد علی کے قبضہ کے وقت) مکہ پہنچا تھا، اور جس کی کتابیں اس کے صحت بیان اور وقت نظر کی شاہد ہیں، لکھتا ہے:

"وہابی اقدام کی تہ میں بری رسموں کے ختم کرنے کی زبردست مخلصانہ خواہش کام کر رہی تھی، غدار سے غدار دشمنوں سے بھی انہوں نے وعدہ شکنی نہ کی۔ اگر ترکوں (مصریوں) سے ان کے طرز عمل کا مقابلہ کیا جائے تو ہمیں ترکوں کی تمام وہ مصلحات گنانا پڑیں گی، جن میں وہ آلودہ ہیں"[2]۔

برک ہارٹ کی پوری کتاب میں سعود اور عبداللہ کے لئے تعریف[3] کے سوا کچھ نہیں۔

---

[1] ہوگارتھ ص ۸۰ [2] ہوگارتھ ص ۹۰ [3] برک ہارٹ ج ۲ ص ۱۸۰-۱۲۰

تیسرا باب

تصنیفات حکیمِ مشرق اور جدید دنیائے اسلام کے پہلے سیاسی مفکر، سید جمال الدین افغانی (ف ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء) کے متعلق عصرِ حاضر کے مشہور عرب سیاست دان اور مجاہد امیر شکیب ارسلان (ف ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۶ء) نے ایک[1] جگہ کیا خوب لکھا ہے:

"انہیں تصنیف و تالیف کی کثرت سے خاص دلچسپی نہیں تھی - وہ کتابوں کے مؤلف نہیں تھے، بلکہ حکومتوں اور قوموں کے مصنف تھے۔"

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے متعلق بھی یہ فقرہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دہرایا جا سکتا ہے۔ پھر بھی تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں شیخ نے جو کچھ لکھا، وہ کچھ ایسا کم بھی نہیں ہے۔ نیز علمی لحاظ سے بھی اس کا پایہ بلند ہے - ان تحریروں میں متکلمانہ موشگافیاں اور یونانی علوم سے متاثر متاخرین فقہاء کی دور از کار باتیں نہیں ملیں گی۔ وہ ٹھیٹھ محدثانہ طریقہ پر لکھتے ہیں۔ جو بات کہی، وہ ٹوک سیدھے سادھے الفاظ میں، کتاب و سنت کے

---

[1] حاضر العالم الاسلامی (ج ۲، ص ۳۰۱) امیر کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ وبالجملة فانه لم یکن یحفل بوفرة التصانیف، وانما کان یؤلف الامم ویصنف الممالک۔

نصوص سے آراستہ و پیراستہ۔ سچائی اور حقانیت کے پیکر کو ظاہری جمال آرائش کی کیا ضرورت؟ سچائی اپنے اندر خود ایک نامعلوم کشش رکھتی ہے۔

ان کی تصنیفات کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان پر یونان اور یونانی علوم کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں پڑی۔ ہمارے ہاں ہندوستان کے بڑے سے بڑے مجددین امت کی کتابیں بھی یونانی گورکھ دھندوں اور "اشراقیت" کے اثرات سے یکسر پاک نہ رہ سکیں۔ شیخ کا طریقہ بالکل قرآنی ہے اور ان کی دلیلیں، جزء و کل، قرآن و حدیث سے ماخوذ ہوتی ہیں۔

دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہاں تصوف کی اصطلاحات بھی ناپید ہیں۔ ویدانت اور نو افلاطونی فلسفے کے اس معجون مرکب نے (جس کا نام لوگوں نے تصوف[1] رکھ چھوڑا ہے) اسلام کی بنیادیں کھوکھلی کر ڈالیں۔ اسلامی ہند کے مجددین نے یہ بڑی غلطی کی کہ وہ اس افیون کا استعمال کراتے رہے۔ افیون

---

[1] بعض دوستوں نے یہ فرمائش کی ہے کہ تصوف کی مخالفت عمومیت کے ساتھ نہ کی جائے بلکہ جیسے علماء سوء کے فقرے سے بے عمل علماء کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ اسی طرح صوفیہ سوء کی اصطلاح مکار اور بدعتی نوع کے صوفیوں کے لئے استعمال کی جائے۔ ہمیں اس مشورے کے قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا، اگر ہمارے سامنے "تصوف" کی تباہ کاریاں نہ ہوتیں۔ باقی وہ جس "احسان" اور اسلامی طریق تزکیہ کی دعوت دیتے ہیں، اس سے کس کافر کو اختلاف ہوگا؟ اختلاف اس غیر ماثور اصطلاح (تصوف) سے ہے جس کے پردے میں دین دھاندلی، جعل و فریب کا بازار گرم رہتا ہے اور اس فتنہ عام سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ اس لبادہ ہی کو اتار کر پھینک دیا جائے۔

بہر حال افیون ہے، آپ اس کے لاکھ "بدرقے" استعمال کرائیے، اس کے برے اثرات بہر حال اعضائے رئیسہ کو تباہ کرتے جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان کے مسلمان آج تک اس "مایا جال" سے نہ نکل سکے۔ لیکن شیخ کے صحیح علاج اور اس افیون سے مکمل پرہیز کے باعث نجد اور نواح نجد کے مسلمان اس گورکھ دھندے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل گئے۔

جہاں تک شیخ کے طرز بیان کا تعلق ہے، اس میں کوئی الجھاؤ نہیں البتہ زبان و انشاء امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) اور شاہ ولی اللہ (ف ۱۱۷۶ھ) کی طرح بہت بلند نہیں۔

لیکن ان کی تحریروں میں ایک دوسری انمول چیز ہے، جو پورے اسلامی لٹریچر میں خال خال نظر آتی ہے اور آٹھویں صدی ہجری کے بعد تو بالکل عنقا ہو گئی تھی۔ آپ اجازت دیں، تو ہم اقبالؒ کی زبان میں اسے "نفس" سے تعبیر کریں۔ ان کی ہر سطر تاثیر میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاید یہ اس دینی تڑپ کا اثر ہو، جس نے انہیں عمر بھر بے قرار رکھا۔ آخر ان میں کوئی چیز تو تھی جس نے آن کی آن میں نجد اور اس کے نواح کی کایا پلٹ کر دی۔ خلاصہ یہ کہ ان کی چھوٹی بڑی تمام کتابوں اور تمام مختصر رسائل میں یہ تاثیر زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

ہمیں شیخ کی حسب ذیل تالیفات کا علم ہو سکا ہے:

(۱) کتاب التوحید: شیخ کی تصنیفات میں یہ رسالہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ جس طرح ہندستان کے خوش فہموں میں مولانا اسماعیل شہید (ش: ۱۲۴۶ھ) کی "تقویۃ الایمان" بدنام ہے، اسی طرح عرب و عجم کے اکثر خوش عقیدہ لوگوں میں

کتاب التوحید بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی۔ اس کا پورا نام کتاب التوحید الذی ھو حق اللہ علی العباد) ہے۔ اس میں شیخ نے توحید کی حقیقت، اس کے حدود، شرک اور اس کی خرابیاں، اور اس میں ابتلا کے تمام راستوں (استعاذہ، استغاثہ، توسل، دعا، نذر، ذبح، سحر، کہانت، فال، وغیرہ وغیرہ) کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ اپنی طرف سے بہت کم کہا ہے۔ ہر باب کے مطابق قرآن و حدیث کی صاف اور واضح شہادتیں جمع کر دی ہیں۔

یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ بار بار ہزار، دس ہزار کی تعداد میں طبع ہوئی۔ مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ اردو میں بھی کئی ایک ترجمے ہو چکے ہیں۔ انگریزی ترجمہ کا اب تک پتہ نہیں چلا[1]۔

علمائے نجد نے اس پر شرحیں بھی لکھی ہیں، جن میں بعض بہت مفید اور پر مغز ہیں۔ بروکلمن نے دو شرحوں کا ذکر کیا ہے[2]۔

---

[1] انڈیا آفس کی عربی فہرست (ج ۲ صہ ۳۸۴: عدد ۲۰۵۰) میں کتاب التوحید کے انگریزی ترجمہ کا حوالہ دیا گیا ہے (جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی: سنہ ۱۸۷۴ء) حالاں کہ وہ ترجمہ شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب کے اس رسالے کا ہے، جو انھوں نے سنہ ۱۲۱۸ھ میں فتح مکہ کے وقت تالیف کیا تھا۔ یہ شبہ بروکلمن کو بھی ہوا تھا (ج ۲ صہ ۳۹) لیکن ذیل (ج ۲: صہ ۵۳۲) میں اس نے تصحیح کر لی۔ لیکن تصحیح کے بعد بھی سنہ کی غلطی رہ گئی۔ سنہ ۱۸۷۴ء کی جگہ سنہ ۱۸۲۰ء چھپ گیا ہے۔ شیخ عبداللہ کے رسالہ کا ترجمہ اوکنلی (O'Kinely) کے قلم سے ہے اور اس نے عجیب غریب غلطیاں کی ہیں۔ کسی موقع پر ذکر آئے گا۔

[2] تکملہ تاریخ ادب عربی (جرمن): ذیل (ج ۲، صہ ۵۳۱-۲)

(الف) الدر النضید لاحمد بن حسن النجدی جو دلی میں طبع ہوئی (۱۳۱۱ھ)۔
(ب) فتح اللہ الحمید المجید مصنفہ حامد بن محمد بن حسن، جو امرتسر میں چھپی (۱۸۹۷ء)

پہلی کا ہمیں علم نہیں ہو سکا۔ دوسری شرح ادھوری اور معمولی ہے لیکن بروکلمن نے سب سے اہم شرح فتح المجید کا ذکر نہیں کیا۔ یہ اصل میں سلیمان بن عبداللہ بن شیخ (ش ۱۲۳۳ھ) نے لکھنا شروع کی تھی، لیکن نامکمل رہی۔ تکمیل شیخ عبدالرحمان بن حسن بن شیخ (ف ۱۲۸۵ھ) نے کی، اور کافی اضافے بھی کئے، اور ہمارے سامنے جس شکل میں ہے، وہ شیخ ابن حسن ہی کی ترتیب دی ہوئی ہے۔ اس شرح میں تمام مسئلوں پر سیر حاصل بحث ہے۔ جا بجا امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) اور ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کی کتابوں سے طویل اقتباسات دیئے ہیں۔ اور اس طرح یہ شرح ایک جامع اور مفید کتاب ہو گئی ہے۔

یہ پہلے مطبع انصاری، دہلی میں چھپی تھی۔ (۱۳۱۱ھ)۔ دوبارہ مطبعہ سلفیہ مصر میں بحرین کے مشہور تاجر شیخ عبدالرحمان قصیبی کے صرفہ سے معمولی کاغذ پر چھپی (۱۳۴۷ھ) اور مفت تقسیم ہوئی۔

اب تیسری مرتبہ مطبع انصار السنۃ المحمدیہ، قاہرہ میں شیخ محمد حامد الفقی کے اہتمام سے نہایت آب و تاب کے ساتھ چھپی ہے (۱۳۵۷ھ) آغاز میں محمد حامد الفقی نے مصنف کے حالات بھی دیئے ہیں، جو عنوان المجد سے منقول ہیں۔ ناشر نے جا بجا احادیث کی تخریج بھی کی ہے، نیز شرح میں جہاں جہاں امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کے اقوال بلا حوالہ نقل کئے گئے ہیں، وہاں ناشر نے حاشیہ میں اصل

کتابوں کا ٹھیک ٹھیک حوالہ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سے مراجعت میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔

شیخ عبدالرحمان بن حسن نے اس مفصل شرح (جو شیخ سلیمان بن عبداللہ کی نامکمل شرح کی تکمیل ہے) کے علاوہ، کتاب التوحید پر کچھ تعلیقات، کرائے تھے، وہ بھی الگ قرۃ عیون الموحدین کے نام سے چھپ گئے ہیں (مطبع المنار مصر ۱۳۶۶ھ)۔ راقم کی نگاہ سے یہ کتاب نہیں گزری۔ محمد حامد الفقی نے فتح المجید کے حواشی میں کہیں کہیں اس کے اقتباسات دیئے ہیں۔

(۲) کشف الشبہات من التوحید۔ اسے ہم کتاب التوحید، کا تکملہ کہہ سکتے ہیں۔ یوں تو شیخ کی تمام کتابیں توحید سے متعلق ہیں، اور کتاب التوحید کا تتمہ کہی جا سکتی ہیں لیکن رسالہ کشف الشبہات میں توحید ہی توحید ہے۔ عام طور پر لوگوں کو توحید کے متعلق جو شکوک ہوتے ہیں ان کا ازالہ کیا گیا ہے۔ کسی کو ولی، غوث کا خیال آتا ہے، کوئی توسل اور استغاثہ کی راہ سے بھٹکتا ہے۔ کہیں شفاعت سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس رسالہ میں ان سب شبہات کا قلع قمع کیا گیا ہے۔ انداز استدلال یکسر قرآنی ہے۔ کہیں ادنیٰ ابہام نہیں۔ اور نہ متاخرین کے جدلیہ طرز بیان کا کہیں سایہ بھی پڑنے پایا ہے۔ ایک چھوٹا سا رسالہ معلومات اور فوائد کا گنجینہ ہے۔ بار بار چھپ چکا ہے، ہمارے سامنے وہ نسخہ ہے، جو عیسیٰ بن رمیح نجدی کے مجموعہ (۱۳۲۰ء-۵۶) میں چھپا ہے۔

(۳) الاصول الثلاثۃ وادلتہا: معرفت رب، معرفت دین اسلام، معرفت نبی۔

ان تینوں اصولوں کی دل نشین انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔ نہایت چھوٹا سا رسالہ ہے۔

(۴) شروط الصلاۃ وارکانہا: اس مختصر رسالے میں نماز کی شرطوں (اسلام[1]، عقل[2]، تمیز[3]، رفع حدث[4]، ازالت نجاست[5]، ستر عورۃ[6]، دخول وقت[7]، استقبال قبلہ[8] اور نیت[9]) کی توضیح کی گئی ہے۔ نیز نماز کے ارکان اور واجبات بھی بیان کئے گئے ہیں۔

(۵) اربع قواعد: اس رسالہ میں بھی توحید کے بعض پہلو نہایت موثر اور سادہ طریقہ پر بیان کئے گئے ہیں۔ چار اہم قاعدے یہ ہیں:

(الف) کفار عرب بھی اللہ تعالےٰ کو "خالق، رزاق اور مدبر" مانتے تھے لیکن اس سے وہ "اسلام میں داخل نہ ہو سکے"

(ب) کفار عرب بھی "اولیاء من دون اللہ" کو قربت اور شفاعت ہی کے لئے پکارتے تھے۔ ویقولون ھٰؤلاء شفعاؤنا عند اللہ۔

(ج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ملائکہ، انبیاء، صالحین، اشجار، احجار، شمس، قمر" کی پرستش کرنے والوں سے یکساں قتال کیا اور ان مختلف قسم کے مشرکوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھی۔

(د) اس زمانہ کے مشرک پہلے مشرکین سے گئے گزرے ہیں۔ وہ تو کم از کم مصیبتوں میں اللہ کو یاد کر لیا کرتے تھے اور موجودہ زمانہ کے مشرک ہر حال میں "اولیاء من دون اللہ" ہی کو پکارتے ہیں۔

اس مختصر رسالے میں انہیں چار قواعد کی آیات قرآنی سے توضیح کی گئی ہے
یہ تینوں رسالے علی بن زمیع نجدی کے طبع کرائے ہوئے مجموعہ میں ایک ساتھ چھپے ہیں (صـ ۲۷) مطبع المنار، قاہرہ ۱۳۴۰ھ؛ نیز مجموعۃ الکتاب المفید مطبوعہ مکہ مکرمہ (۱۳۴۳ھ) میں بھی یہ رسالے شامل ہیں۔

(۶) اصول الایمان: ایمان کے مختلف ابواب کی احادیث سے تشریح کی گئی ہے۔ آغاز کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے بعض فرزندوں نے اصل رسالہ میں کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ "وقد زاد فیه بعض اولاده زیادۃ حسنۃ"
پہلے دہلی میں چھپا تھا۔ اب مجموعۃ الحدیث النجدیہ (قاہرہ: مطبع المنار ۱۳۴۲ھ) کے ضمن میں طبع ہوا ہے (صـ ۲۴۰ - ۲۰۹)۔

(۷) کتاب فضل الاسلام: اسلام کے شرائط کی توضیح کے ساتھ ساتھ بدعت و شرک کی برائیاں کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ (مجموعۃ الحدیث النجدیہ: صـ ۲۵۵-۲۴۲)۔

(۸) کتاب الکبائر: کبائر کے تمام اقسام، الگ الگ ابواب کی صورت میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، ہر باب میں قرآن و حدیث کے نصوص سے توثیق کی گئی ہے بلکہ مصنف نے اپنی طرف سے بہت کم لکھا ہے۔ قرآن کریم اور سنت نبوی کا سلیقہ کے ساتھ جمع کر دینا، اپنی جگہ پہ خود ایک کام ہے۔
(مجموعۃ الحدیث النجدیہ، صـ ۳۱۰ - ۲۵۸)

(۹) نصیحۃ المسلمین: یہ ایک مستقل کتاب ہے جس میں اسلامی تعلیم کے تمام شعبوں پر الگ الگ بابوں میں حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں۔ مصنف نے اپنی

طرف سے بہت کم، بلکہ کچھ نہیں لکھا ہے: (مجموعۃ الحدیث صـ۱۲ ۳-۴۴۴)

(۱۰) ستۃ مواضع من السیرۃ: سیرت طیبہ کے چھ مقامات کی توضیح اور ان کے نکات پر چھوٹا سا رسالہ ہے، وہ چھ مقام (ستۃ مواضع) یہ ہیں:

(ا) نزولِ وحی کی ابتداء ؛ (ب) تعلیم توحید اور کفار کا رویہ ؛

(ج) "تلک الغرانیق العلیٰ" کا واقعہ ؛

(د) ابوطالب کا خاتمہ ؛

(ہ) ہجرت کے منافع اور ان سے سبق ؛

(و) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد کا واقعہ۔

(مجموعۃ الکتاب المفید: صـ۲۳-۱۹)

(۱۱) تفسیر الفاتحۃ: سورۂ فاتحہ کی نہایت ہی مختصر تفسیر، لیکن اس میں بھی شیخ کا جذبۂ توحید سطر سطر سے نمایاں ہے۔ (مجموعۃ الکتاب المفید: صـ ۱۹-۱۸)

(۱۲) مسائل الجاہلیۃ: اس رسالہ میں شیخ نے ایسے ایک سو اکتیس مسئلے بیان کئے ہیں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل جاہلیت اور ان کے معتقدات کی مخالفت کی ہے۔ محمود شکری آلوسی (ف ۱۳۴۲ھ) نے اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ (الزہرار: صـ ۵۲-۴۴)

(۱۳) تفسیر الشہادۃ: کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر جس میں توحید کی اہمیت دلنشین انداز میں واضح کی گئی ہے (〃: صـ۸-۸)

(۱۴) التفسیر علی بعض سور القرآن[1]: مختلف آیتوں اور سورتوں پر شیخ الاسلام کی تعلیقات

---

[1] فہرست مشروح اور ینٹیل لائبریری، پٹنہ: ج ۱۸ / ۲: ۱۴۷۷

کے مجموعہ کا نام ہے۔ ایک ایک آیت سے بیسیوں مسئلے استنباط کرتے جاتے ہیں۔ یہی اس کی خاص خصوصیت ہے۔

(۱۵) کتاب السیرۃ: یہ سیرت ابن ہشام کا خلاصہ ہے۔ پٹنہ لائبریری میں اس کا ایک بہت اچھا اور قدیم نسخہ ہے[۱]۔

(۱۶) الہدی النبوی: امام ابن القیم کی زاد المعاد کا مختصر۔ کتاب کے اوپر صرف مختصر الہدی النبوی لکھا ہوا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پٹنہ[۲] لائبریری میں ہے۔ ان کے علاوہ شیخ کے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے ہیں، جن کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ بعض رسالے اور استفسارات کے جوابات روضۃ الافکار میں درج ہیں[۳]۔

---

[۱] فہرست مشروح، جلد ۱۵، ص ۱۰۳۸/۱۔
[۲] فہرست مشروح، ج ۱۵، ص ۱۰۳۸/۱
[۳] جلد اول، فصل ثالث و رابع

چوتھا باب

دعوت

سیاست کی کارفرمائی

مصر جدید کے مشہور عالم اور سید جمال الدین افغانی کے رفیق خاص، شیخ محمد عبدہ (ف ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) سیاست اور اس کی "بے انصافیوں" سے پناہ مانگتے تھے "ما دخلت السیاسۃ فی شیءٍ إلا أفسدتہ" ان کا مشہور فقرہ ہے - اور ایک حد تک یہ بیچ بھی ہے - مقصد برآری کے لئے ارباب سیاست، جائز اور ناجائز کا خیال نہیں کرتے اور اس لئے صداقتوں کے مسخ کرنے میں وہ عارضی طور پر کامیاب ہو جاتے ہیں

شیخ الاسلام کی دعوت، جسے وہابیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ کتاب و سنت کی صحیح تعلیم کے سوا وہ اور کچھ نہیں پیش کرتے لیکن سیاسی اغراض کے ماتحت شیخ کی دعوت کو وہابیت کا نام دے کر اس طرح پیش کیا گیا جیسے اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کی دعوت دی جا رہی ہو۔

سو، اتفاق سے اہل نجد کے بدنام کرنے میں تین جماعتیں شریک ہوگئیں ترکی اور مصری حکومتوں سے تو براہ راست ٹکر تھی، اور جنگ و پیکار کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ حکومت ہند سے بھی ایک وڈکر ہوگئی تھی۔ اس لئے تینوں حکومتوں اور ان کے وظیفہ خواروں نے اس "کارخیر" میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کے علاوہ اشراف مکہ اور ان کے حواری اپنے نذر و نیاز کی آمدنیوں کی بندش پر الگ برہم تھے۔ نیز عام یورپی سیاح (انگریزوں کے علاوہ بھی) جزیرۃ العرب میں صحیح مذہبی بیداری کو اچھی آنکھوں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ مختلف اسباب کے ماتحت، مختلف حکومتوں اور جماعتوں نے شیخ کی دعوت کی برائی اور بدنامی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج سے کچھ دنوں پہلے تک "وہابیت" نے ایک "ہوے" کی شکل اختیار کر لی تھی۔ پھر ہندوستان میں حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی اور مولانا اسماعیل شہیدؒ دہلوی کی تحریک و تجدید و

لہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قبروں اور قبوں کی آمدنیوں پر ایک بڑی جماعت کا گذارہ تھا۔ ۱۲۱۸ھ میں سعودی قبضہ کے بعد ان کی روزی بند ہوگئی، تو یہ دعوت کے مخالف بن گئے اور روزانہ طرح طرح کی غلط بیانیاں کرنے لگے۔ جبرتی (ج ۳ ص ۲۵۵) صفر ۱۲۱۸ھ کے حوادث میں لکھتا ہے:۔

"حاجیوں کے ساتھ، اہل مکہ کی بڑی تعداد وہابیوں کے خوف سے بھاگ کر آئی ہے۔ لوگ "وہابی" کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ بعض اسے خارجی اور کافر بتاتے ہیں۔ یہ رائے اہل مکہ اور ان کے پیروؤں کی ہے۔ اور بعضے بے غرضی کی وجہ سے، ان کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔" الخ الخ۔

جہاد کو "وہابیت" کا نام دے کر، اسے اسلام سے الگ ایک خارجی قسم کے مذہب[۱] کی حیثیت دے دی گئی۔

آج سے تیس چالیس برس پہلے، ان غلط الزامات کے قبول کرنے کی کوئی توجیہ کی جا سکتی تھی۔ اہل نجد کی کتابیں عام طور پر نہیں ملتی تھیں، اور خود علماء نجد اپنے محدود علاقہ سے باہر تبلیغ و اشاعت پر بہت کم توجہ کرتے تھے۔ اس لئے اس وقت یہ بہت ممکن تھا، کہ کوئی شخص سچائی کے ساتھ ان کے متعلق غلط رائے رکھتا ہو۔ لیکن، آج کہ شیخ اور ان کے شاگردوں کی تصنیفات چھپ کر عام ہو چکی ہیں، لاعلمی کا عذر مسموع نہیں ہو سکتا۔

شیخؒ کا فقہی مسلک

مختصر طور پر تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ دین کو اس کی اصل شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ عقائد و اعمال، ہر چیز میں سلف کی پیروی ان کے دل سے لگ گئی تھی۔ فروع فقہ میں وہ امام اہل سنت احمد بن حنبلؒ (ف ۲۴۱ھ) کے مسلک پر عمل کرتے تھے۔ لیکن حنابلہ کے مسلک کے خلاف کوئی حدیث مل جانے پر انہیں کوئی طاقت اس حدیث پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔

واما مذہبنا فمذہب الامام احمد بن حنبل امام اہل السنۃ فی الفروع، ولا ندعی	ہمارا مذہب فروع اور احکام میں امام اہل سنت، امام احمد بن حنبل کا مذہب ہے اور ہم اجتہاد کا دعوے نہیں کرتے۔ اور جب

۱ـ مذہب: یہاں عربی مفہوم میں، استعمال ہو رہا ہے: ھو ما ذھب الیہ احد الائمۃ، اردو میں مذہب "دین" کا مرادف ہو گیا ہے۔

الاجتهاد واذا بانت لنا سنة صحيحة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم عملنا بها، ولا نقدم عليها قول احدٍ كائناً من كان[1]

رسول اللہ کی کوئی صحیح سنت ہم پر آشکارا ہو جاتی ہے۔ تو ہم اس پر عمل کرتے ہیں اور اس پر کسی کا خواہ کوئی بھی ہو، قول مقدم نہیں کرتے۔

امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ کے اقوال سے وہ بسا اوقات استدلال کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تقلید کا پھندا ابھی شیخؒ نے گردن میں نہیں ڈالا۔ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ اسی وقت تک ان کے پیش رو ہیں، جب تک ان کے علم کے مطابق وہ کتاب و سنت سے منحرف نہیں ہوتے، بلکہ وہ امام یا عالم ان کی نگاہ میں صرف اس لئے محبوب ہے کہ وہ کتاب و سنت پر صحیح صحیح عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

الامام ابن القيم وشيخه اماما حق من اهل السنة، وكتبهم عندنا من اعز الكتب الا انا غير مقلدين لهم في كل مسئلة[2]

امام ابن القیم اور ان کے استاد دونوں اہل سنت کے ائمہ حق میں سے ہیں اور ان کی کتابیں ہمیں بہت محبوب ہیں مگر یہ کہ ہر مسئلہ میں ہم ان کے مقلد نہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے، وہ حنبلی مسلک کی اتباع کرتے ہوئے بھی، دوسروں کو اس کی پیروی پر مجبور نہیں کرتے۔ وہ شافعی کو شافعی اور

---

[1] الہدیۃ السنیۃ: ص ۹۹ [2] الہدیۃ السنیۃ: ص ۵۳

حنفی کو حنفی بننے کی دعوت دیتے ہیں۔ بدعات اور بیہودہ رسمیں کسی امام نے روا نہیں رکھیں۔ غنا اور مزامیر کے بارے میں فقہائے حنفیہ سے کون زیادہ سخت ہے؟ لیکن آج ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے کو "حنفی" کہنے والے کیا کیا نہیں کر رہے ہیں؟

یہ شیخ کے فقہی مسلک کی مزید توضیح کے لئے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

ونحن ایضاً فی الفروع علی مذهب الامام احمد بن حنبل ولا ننکر علی من قلّد احد الاربعة دون الغیر لعدم ضبط مذاهب الغیر کالرافضة الخ	(ہم بھی فروع میں امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب[1] پر ہیں، اور ائمہ اربعہ کے مقلدین پر نکیر نہیں کرتے۔ البتہ ان کے علاوہ دوسروں کی تقلید روا نہیں رکھتے، اس لئے کہ اوروں کے مذاہب صحیح طور پر مدون نہیں جیسے روافض وغیرہم
ولا نستحق الاجتهاد المطلق ولا احد لدینا یدّعیها الا اننا فی بعض المسائل اذا صح لنا	اور ہم "اجتہاد مطلق" کے اہل نہیں، اور نہ ہم میں سے کوئی اس امر کا دعوے کرتا ہے۔ مگر یہ کہ بعض مسائل میں اگر

---

[1] مارگولیوتھ نے شیخ الاسلام اور امام احمد بن حنبلؒ کے اختلافات کی ایک فہرست دی ہے جو انتہائی جاہلانہ ہے۔ مثال کے طور پر وہ لکھتا ہے کہ نماز باجماعت شیخ کے نزدیک فرض (Obligatory) ہے۔ اور امام کے ہاں نہیں۔ اس سے زیادہ جہل کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ (مقالہ وہابیت: انسائیکلو پیڈیا آف اسلام)

نص جلی من کتاب او سنۃ غیر منسوخ ولا مخصص ولا معارض باقوی منہ وقال بہ احد الائمۃ الاربعۃ اخذنا بہ وترکنا المذہب کارث الجد والاخوۃ فانا نقدم الجد وان خالف مذہب الحنابلۃ۔[1]

کتاب یا سنت کی کوئی غیر منسوخ واضح نص سامنے آجائے، جس کی تخصیص یا تعارض بھی کسی دوسرے قوی نص سے نہ ہوا اور ائمہ اربعہ میں سے کسی نے اسے اختیار کیا ہو، تو ہم اس پر عمل کرتے ہیں، جیسے جد اور بھائیوں (اخوۃ) کے ترکہ میں ہم حنابلہ کے مسلک کے خلاف، جد کو "اخوۃ" پر مقدم رکھتے ہیں۔

عقائد عقائد کے باب میں وہ "سلف" کے مسلک پر ہیں۔ قرآن کریم اور صحیح حدیثوں میں اللہ تعالیٰ کی جو صفتیں آئی ہیں، انہیں ہو بہو تسلیم کرنا اور "کیفیت" کی نفی کے ساتھ ان کے ظاہر پر ایمان لانا، یہی سلف کا مسلک ہے۔

صفات کا مسئلہ علماء اسلام کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے۔ ایک جماعت "تشبیہ" اور "تمثیل" کے خوف سے "صفات" ہی کا انکار کر بیٹھی۔ یہ گویا اللہ کو معطل کر دینا ہوا۔ دوسری جماعت "صفات" کی قائل ہوئی، تو "تشبیہ" اور "تکیف" کی حد تک آگئی۔ یہ بھی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات "جسمیت" سے منزہ ہے۔ متکلمین اشاعرہ نے اس "تعطل" اور "تشبیہ" سے بچنے کے لئے ان تمام آیتوں اور حدیثوں کی تاویل شروع کر دی۔ وہ "استوا" سے "استیلاء" مراد لینے لگے۔ اسی طرح "ید اللہ" کی تفسیر "نعمت"

---

[1] بحوالہ تاریخ نجد للآلوسی: ص ۴۹-۵۰؛ صیانۃ الانسان: ص ۱۷۱

اور "قدرت" سے کرنے لگے۔ (فانک باعیننا) سے حفظ و نگہداشت کے معنی لیے گئے۔ لیکن "سلف" اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے اس "تاویل" سے اتفاق نہیں کرتے۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ ان الفاظ سے جو آپ مراد لے رہے ہیں۔ وہی مراد الٰہی بھی ہے؟ اور پھر تاویل کرنے والوں کو بعض آیتوں اور حدیثوں کی تاویل میں ایسی دور از کار تاویلیں کرنا پڑتی ہیں کہ پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ ابن فورک (ف سنہ ۴۰۶ھ) کی "مشکل الحدیث" میں اس "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کی بے شمار مثالیں نظر سے گزریں۔ سلف کا مسلک، اس "تکییف" و "تعطیل" اور تاویل سے الگ ہے۔ ائمہ سلف کا مسلک امام ابن تیمیہؒ کی زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:-

"ائمہ سلف کا مذہب یہ ہے کہ ہم اللہ کو تحریف، تعطیل، تکییف، تمثیل کے ادنیٰ شائبہ کے بغیر ان صفتوں کے ساتھ متصف کریں، جن کے ساتھ خود اس نے اپنے کو اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متصف کیا ہے۔ تو ان صفات کی نفی جائز نہیں، جن سے اس نے اپنے کو متصف کیا ہے، اور نہ ان صفات کو مخلوق کی صفتوں کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ بلکہ اس کی ذات ان چیزوں سے منزہ ہے۔ اس کا مثل کوئی نہیں۔ نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ افعال میں۔ تو سلف کا مذہب، دو مذہبوں کے بین بین اور دو گمراہیوں کے درمیان اعتدال کی راہ ہے یعنی صفات کا اثبات اور مخلوقات کے ساتھ مماثلت کی نفی[1] الخ الخ

---

[1] الانتقاد الرجیح (علی حاشیۃ جلاء العینین) ص ۲۰۳

تو گویا سلف کا مسلک اثبات اور نفی کے درمیان ہوا۔ وہ ید، عین اور اس قسم کی دوسری صفتوں کی تاویل نہیں کرتے، بلکہ ان کے ظاہر ہی پر ایمان لاتے ہیں لیکن مماثلت کی نفی کے ساتھ "ید" اور "عین" سے صفات باری ہیں وہ معنی نہیں سمجھے جائیں گے جو انسانوں کے ساتھ سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کیف اور جسمیت سے منزہ ہے۔ اصل مفہوم اور کیف کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ہمارا کام بے چون وچرا ایمان لانا ہے۔ امام دار الہجرۃ، مالک بن انس کا مشہور مقولہ مسلک سلف کا بہترین ترجمان ہے۔

الاستواء غیر مجہول	استواء نا معلوم نہیں اور کیف کا تصور
والکیف غیر معقول والایمان	اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ نہیں کیا جا
بہ واجب السؤال عنہ بدعۃ	سکتا اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق کریدنا بدعت ہے[1]

یہ سلف کا مسلک صرف حنابلہ یا امام ابن تیمیہؒ اور شیخ محمد بن عبد الوہاب کا نہیں بلکہ تمام ائمہ اسلام کا یہی مسلک رہا ہے "تشبیہ اور تجسیم کی نفی کے ساتھ تاویل سے بچنا" (الاحتراز عن التاویل مطلقاً مع نفی التشبیہ والتجسیم) تمام ائمہ کا مسلک رہا ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، محمد بن الحسن سعد بن معاذ مروزی، عبد اللہ بن المبارک، سفیان ثوری، امام بخاری، ترمذی، ابو داؤد سجستانی وغیرہم سب اسی مسلک پر گامزن رہے ہیں[2]

خود امام ابو الحسن اشعری سے رجوع ثابت ہے۔ امام الحرمین سے بھی اس کی

---

[1] جلاء العینین صـ ۲۱۲ ٭ [2] جلاء العینین صـ ۲۲۹ ٭

تائید منقول ہے۔ تمام صحابہ اور تابعین کا تو یہ مسلک تھا ہی، تاویل کا دروازہ تو "عقلیت" کی گرم بازاری کے بعد کھلا۔

متاخرین اشاعرہ اور عام علمائے اسلام (متاخرین) کا مسلک 'تاویل' کا رہا ہے۔ مدرسوں میں 'عقائد' کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ یہی اہل تاویل کا مسلک ہے۔ لیکن تاویل کے وہ معنی تو ان الفاظ کا ایک محل ہے۔ ایسی بیسیوں تاویلیں اور بھی کی جا سکتی ہیں۔ یہ کہاں سے ثابت ہو گیا کہ آپ کی تاویل عین مراد الٰہی کے مطابق ہے۔ اور اگر اس کا یقین نہیں (اور یقینی نہیں)، تو ہم پھر اپنے کو خطرہ میں کیوں ڈالیں؟ سلامتی اسی میں ہے کہ اسلاف کے طریقہ کے مطابق ہم بھی (کل ما ورد فی الشرع) پر 'بلاتعطیل و تکییف' کے اعتقاد رکھیں۔ یہی پہلے بزرگوں کا مسلک ہے اور اسی پر آج بھی ہیں۔ اہل توحید و سنت اعتقاد رکھتے ہیں۔ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب اور ان کے پیروؤں کا بھی یہی عقیدہ ہے:

"...... وبالجملة فعقيدتنا في	خلاصہ یہ کہ ان تمام صفات کے
جميع الصفات الثابتة في	بارے میں جو کتاب و سنت میں ثابت
الكتاب والسنة عقيدة اهل	ہیں، ہمارا عقیدہ اہل سنت والجماعت
السنة والجماعة نؤمن بها ونمر	کا عقیدہ ہے۔ ہم ان پر ایمان رکھتے
بها كما جاءت مع اثبات	ہیں اور زیادہ کریدنے کی کوشش
حقائقها وما دلت عليه من	نہیں کرتے۔ اور ان کے معانی اور حقائق
غير تكييف ولا تمثيل ومن غير	پر اعتقاد رکھتے ہیں لیکن کسی تکییف تمثیل، یا

تعطیل ولا تبدیل ولا تاویل[1] الخ   تعطیل و تبدیل اور تاویل کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دیتے ۔ الخ

آیاتِ صفات کے باب میں 'سلف' کا مسلک مشہور ہے (جس کی مختصر توضیح اوپر کی گئی)، صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ شیخ الاسلام بھی 'سلف' کا عقیدہ رکھتے تھے ۔ قرونِ اولیٰ کے بعد امام ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) سے زیادہ کسی نے اس سلسلہ میں تکلیفیں نہیں اٹھائیں ۔ اشاعرہ اور متکلمین کے خیالات ذہن اور دماغ پر کچھ اس طرح مسلط ہو گئے تھے کہ راہِ حق بھی لوگوں کو جاہلوں اور کم عقلوں کا مسلک نظر آتی تھی ۔

بہرحال امام ابن تیمیہؒ کی طرح شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب بھی 'سلف' کے عقیدے پر سختی کے ساتھ قائم رہے ۔ اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے آلوسی کی جلاء العینین[2] فی محاکمۃ الاحمدین ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جہاں فاضل مصنف نے پوری بحث کا نچوڑ دے دیا ہے ۔ ابن تیمیہ، ابن جوزی (ف سنہ ۶۳۴ھ) شیخ عبدالقادر جیلی (ف سنہ ۵۶۵ھ) اور خود امام ابوالحسن اشعری (ف تقریباً سنہ ۳۲۴ھ) کی تصنیفات سے اقتباسات دیئے ہیں ۔

توحید اور اس کے لوازم

شیخ نے اپنی تمام کتابوں اور رسائل میں توحید پر بہت زور دیا ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کی تصنیفات میں صرف توحید ہی توحید ہے ۔ ان کی دعوت بھی 'توحید' کی تھی ۔ شعار کلمہ لا الٰہ الا اللہ تھا ۔ وہ ہر ایک کو اسی کلمہ کا مفہوم سمجھاتے اور اس کی

---

[1] البدیۃ السنیۃ صـ ۹۹ ۔ [2] صـ ۱۶۰-۱۶۱

حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے ۔ اسی لئے ان کے ماننے والے بسا اوقات "مُوحدین" کے نام سے بھی پکارے جاتے ہیں ۔

"توحید" کیا ہے ؟ صرف اللہ تعالیٰ کو عبادت کا مستحق قرار دینا ۔ بات معمولی سی ہے لیکن شیطان کی گھاتیں بہت وسیع ہیں ۔ اس نے ایک اللہ کے پرستاروں سے بھی وہ کام کرائے ، جو شرک کے حدود میں داخل ہوتے ہیں ۔ "اخلاص توحید" کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام اعمال و اقوال سے پرہیز کیا جائے ، جن میں "غیر اللہ" کی شرکت کا ادنیٰ شائبہ بھی پیدا ہوتا ہو ۔ شیخ الاسلام نے ان اعمال و اقوال کی توضیح میں کوئی کمی نہیں کی ۔ ان کے مضرات اور برائیاں کھول کھول کر بیان کیں ، جن راہوں سے یہ برائیاں پیدا ہوتی تھیں ، ان کے روکنے کی کوششیں کیں ۔ لیکن وہ قوم جو سارے عالم کے لئے توحید کا پیغام لے کر نکلی تھی ، بعد کی صدیوں میں خود قبر پرستی ، تعزیہ پرستی اور اس قسم کی دوسری "پرستیوں" کا اس طرح شکار ہوئی ، کہ جب ایک عرصہ کے بعد اس کے کانوں میں توحید کی آواز پہنچی ، تو اسے اجنبیت محسوس ہونے لگی ۔ کتاب و سنت سے نصوص پیش کئے گئے ، تو تاویلیں کی گئیں اور خود توحید کے علمبرداروں کو "وہابی" ، "مشرک" ، "خارجی" اور مختلف فقہی اور مذہبی گالیوں سے نوازا گیا ۔ شیخ الاسلام رح کا سارا قصور یہ ہے کہ انہوں نے کھلم کھلا توحید کی دعوت دی ۔ شرک اور اس کی آلودگیوں سے بچنے کی تاکید کی ۔ اوثان من دون اللہ کی مذمت کی ۔ غیر اللہ کی قسمیں کھانا ، نذریں ماننا اور قبروں کی صاف صاف برائی کی ۔ اور اگر یہ واقعی قصور ہے ، تو پھر ہر مسلمان کو سچے دل سے قصوروار بن جانا چاہئے ۔

ذیل میں ہم ان مخصوص باتوں کو سادہ لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں جو شیخ رح اور اہل سنت کی رائے اور عقیدہ میں توحید سے دور اور شرک سے قریب کرنے والی ہیں:۔

(۱) مصیبتوں میں غیر اللہ کو پکارنا یا اللہ کے ساتھ غیر کو بھی پکارنا: اب جو عام طور پر کم لکھے پڑھے یا پڑھے لکھے خوش عقیدہ "یا رفاعی" "یا بدوی" اور یا "عبدالقادر" (اور ہمارے ہاں: اے داتا پیر بھوڑی سے مخدوم صاحب، اسے مخدوم نجبن وغیرہ وغیرہ) کہہ کر غیر اللہ کو مصیبتوں میں یاد کرتے ہیں، تو یہ "دعا غیر اللہ" شائبہ شرک سے خالی نہیں۔ اس "دعا" میں عبادت کی جھلک آتی ہے۔ "داعی" کی نیت اور "مدعو" کے مرتبہ سے بالکل بحث نہیں۔ ممکن ہے اور بہت ممکن ہے کہ "داعی" کی نیت عبادت یا شرک کی نہ ہو، لیکن ایک مخلوق، دوسرے مخلوق کو مصیبتوں میں پکارے اس سے "دفع ضرر" یا "جلب خیر" کی درخواست کرے، یہ توحید کے سراسر خلاف ہے اور اسلام جیسے دینِ کامل میں اس کی بالکل گنجائش نہیں۔

ان حالات میں جو غیر اللہ کو مصیبتوں میں یاد کرتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں: یا تو وہ جاہل ہے، اور کتاب و سنت کی صحیح تعلیمات کا اسے علم نہیں، تو اسے شیخ الاسلام کے پیرو سیدھی راہ بتانے کی کوشش کریں گے۔ کہ وہ آئندہ اس سے پرہیز کرے، اور اگر کوئی شریعت کا حکم جاننے کے بعد بھی "دفع ضرر" یا "جلب خیر" کے لئے غیر اللہ کو یاد کرتا ہے اور پکارتا ہے، تو پھر وہ اسے مشرک سمجھتے ہیں، اور اس سے کسی قسم کی۔ واداری برتنے کے لئے تیار نہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیتیں ان کے لئے عبرت اور دلیل راہ ہیں:

وَالَّذِینَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهٖ مَا یَمْلِکُونَ مِنْ قِطْمِیْرٍ۔
اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَاءَکُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا
اسْتَجَابُوْا لَکُمْ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَکْفُرُوْنَ بِشِرْکِکُمْ
وَلَا یُنَبِّئُکَ مِثْلُ خَبِیْرٍ۔ (۳۵: ۱۴،۱۵)

(۲) استغاثہ: غیر اللہ سے فریاد چاہنا، اس کا حکم بھی دعاء غیر اللہ کا ہے۔
ابویزید بسطامی کا قول ہے:[1] استغاثة المخلوق بالمخلوق کاستغاثة المسجون بالمسجون۔
مخلوق کا مخلوق سے فریاد چاہنا، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک قیدی دوسرے قیدی سے فریاد طلب کرے۔
طبرانی کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:
"انہ لا یستغاث بی، وانما یستغاث باللہ تعالیٰ"[2]
(مجھ سے فریاد نہیں طلب کی جاتی فریاد تو صرف اللہ سے مانگی جاتی ہے)
خلاصہ یہ ہے کہ زندہ یا مردہ، کسی غیر اللہ سے فریاد چاہنا قطعاً حرام ہے اور اسلامی توحید کے بالکل خلاف ہے۔
(۳) توسل: لفظ توسل تین معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے:
(الف) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا وسیلہ، تو یہ فرض ہے، اس کے بغیر ایمان مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔

---

[1] جلاء العینین: ص ۲۱۲ ۔ [2] بحوالہ جلاء العینین ص ۳۱۳ ۔

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کا وسیلہ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تھا اور پھر قیامت کے دن اس کا موقع ہوگا جب خلقت رسولؐ کی شفاعت کا وسیلہ ڈھونڈھے گی۔

(ج) تیسرا وہ توسل ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کو انبیاء اور صالحین کی ذات کا واسطہ دلایا جاتا ہے۔ تو یہ صحابہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کیا نہ وفات کے بعد، نہ استسقاء وغیرہ کے موقع پر، نہ قبر پہ اور نہ قبر سے ہٹ کر، کسی موقع پر صحابہ سے اس قسم کا غیر مشروع توسل منقول نہیں، جس میں اللہ تعالیٰ کو گویا رسول یا ولی کی ذات کی قسم دی جاتی ہے۔ اور عیہ ماثورہ میں بھی کہیں اس توسل کا پتہ نہیں چلتا۔ توسل کی یہی تین صورتیں ہیں، جن میں سے پہلی صورت (یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم پہ ایمان اور ان کی اطاعت کا وسیلہ پکڑنا) ہمیشہ مشروع ہے۔ دوسری صورت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کو (ذات کو نہیں) وسیلہ بنانا۔ تو یہ رسول اللہ صلی اللہ کی زندگی میں بلاشبہ نافع، اور مطلوب تھا۔ "توسل کے ان دونوں معنوں کا منکر کافر اور مرتد ہے۔" (من انکر التوسل باحد ھذین فھو کافر مرتد) جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ نے تصریح کی ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ دوسری صورت بھی متعذر ہو گئی۔ قبروں پہ سلام اور اہل قبر سے مخاطب ہو کر السلام علیکم کہنا منقول ہے، لیکن مردہ یا غائب سے دعا کی درخواست کرنا بدعت ہے۔ یہی[1] وجہ ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے صحابہ کرام (رضوان اللہ

---

[1] جلاء العینین: صد ۲۸۴

علیہم اجمعین) کے بھرے مجمع میں ارشاد فرمایا (اور کسی نے نکیر نہیں کی)[1]

اللھم انا کنا اذا اجدبنا	اے اللہ، جب ہم پر قحط سالی آتی تھی تو
توسلنا الیک بنبینا فتسقینا	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ پکڑتے تھے، اور تو
وانا نتوسل الیک بعم	ہمیں سیراب کرتا تھا اور (اب) ہم نبی صلی اللہ
نبینا فاسقنا۔	علیہ وسلم کے چچا کا وسیلہ پکڑتے ہیں، تو ہمیں سیراب کر۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت عباسؓ کا وسیلہ پکڑنا بے معنی بات نہیں ہو سکتی۔ چونکہ یہ توسل، طلب دعاء کے لیئے ہوتا ہے اور وفات کے بعد طلب دعاء متعذر رہے، اس لئے حضرت فاروقؓ عم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وسیلہ لائے۔ (یعنی طلب دعاء کے لئے)

اب رہی تیسری صورت جس میں انبیاء اور صالحین کی ذات کو وسیلہ بنایا جاتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کو اولیاء اور صالحین کے نام کی قسم دی جائے، جیسے کوئی کہے۔

اسالک بجاہ عبدک او بحرمۃ

تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حنابلہ کے نزدیک صحیح روایت میں مکروہ تحریمی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور دوسرے فقہاء حنفیہ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ انبیاء، اولیاء،

---

[1] مشکواۃ المصابیح، باب الاستسقاء۔

یا مقامات مقدسہ کسی کے "حق" کا واسطہ دلا کر دعا مانگنا حنفیہ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے لاحق للمخلوق علی الخالق سے ان کا استدلال ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یہی امام تیمیہؒ کا مسلک ہے۔ اور اسی پر شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب اور ان کے متبعین کا عمل ہے۔ وہ کسی نبی یا ولی کی ذات کے ساتھ "توسل" کو روا نہیں رکھتے اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں، تو کوئی نئی بات نہیں کرتے۔ صرف حنفیہ اور حنابلہ کے متفقہ مسلک کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔

متقدمین محقق علماء میں شیخ عزالدین بن عبدالسلام (ف ۶۶۰ھ) صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے توسل کو جائز قرار دیتے ہیں،[1] یعنی ان کے نزدیک "اللھم انی اتوسل الیک بنبیک وحبیبک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یا "اللھم انی اسئلک بجاہ صفیک ونبیک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا جائز ہے۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات اقدس اور ان کے بلند مرتبہ کو سامنے رکھتے ہوئے، شیخ عزالدین بن عبدالسلام جیسے مجتہد النظر عالم تک کا ڈگمگا جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ رہا اولیاء اور صالحین کی ذات کو وسیلہ بنانا، تو متقدمین میں کسی سے منقول نہیں۔ اور اگر بعض متاخرین[2] علماء نے اس کے جواز کی کوشش کی ہے، تو یہ ایک بے اصل اور مشتبہ بات کے رائج کرنے کی کوشش ہے اور اس سے

---

[1] وہ بھی "ان صح الحدیث فیہ" کی شرط کے ساتھ (الدر النضید ص ۶)

[2] ہندوستان میں مولانا اسماعیل شہید (ش ۱۲۴۶ھ) اور اکثر علمائے دیوبند اولیاء اور صالحین کی ذات سے توسل کو جائز کہتے ہیں لیکن راقم کا ذہن اس کے قبول کرنے سے ابا کرتا ہے۔

خواہ مخواہ بدعات کا دروازہ کھلتا ہے۔

یہاں صرف شیخ رح کے مسالک کی توضیح مقصود ہے۔ کسی فقہی بحث کا یہ موقع نہیں۔ مآخذ کے ضمن میں موضوع کی مختلف کتابوں کا ذکر آئے گا۔ التوسل والوسیلۃ کے علاوہ امام ابن تیمیہ کے فتاویٰ اور دوسری تصنیفات بھی ان بحثوں سے بھری پڑی ہیں مختصر طور پر موافق و مخالف بحثوں کے خلاصہ کے لئے: جلاء العینین (صفحہ ۳۱۵-۳۶۹) سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے

(۴) استعاذہ: توحید کا اقتضا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کے اسماء اور صفات کے سوا کسی مخلوق کی پناہ بھی نہ ڈھونڈھی جائے۔ اسی اصل کی بنا پر امام اہل سنت احمد بن حنبل نے 'قرآن کے کلام الٰہی اور غیر مخلوق (کلام اللہ غیر مخلوق) ہونے پر اس حدیث سے استدلال کیا تھا:

اعوذ بکلمات اللہ التامات

یعنی اگر اللہ کا کلام 'مخلوق' ہوتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کلمات اللہ یعنی مخلوق کی پناہ نہ مانگتے (گویا اس وقت یہ بات مسلم تھی کہ مخلوق کے ساتھ استعاذہ (یعنی کسی مخلوق کی پناہ مانگنا) جائز نہیں، ورنہ مخالفین ضرور تردید کرتے۔ خود قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے کاہنوں کی مذمت کی ہے کہ وہ غیر اللہ (جن) کی پناہ مانگتے ہیں:

أَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا ۝ (۷۲:۶)

اسی لئے شیخ رح نے صاحب 'بردہ' [1] کے اس شعر پر اعتراض کیا ہے:

---

[1] بوصیری کا مشہور نعتیہ قصیدہ، جو بعض صوفیہ کے اوراد میں شامل ہے۔

یا اکرم الخلق مالی من اُلوذبہ سواک عند حلول الحادث الجسم

کوئی شک نہیں کہ "مالی من الوذبہ سواک" (میرے لئے تیرے سوا کوئی نہیں، جس کی پناہ لوں) صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہو سکتی ہے۔ شوکانی نے بھی (جو توسل کے مسئلے میں ذرا نرم ہیں) اس شعر پر اعتراض کیا ہے۔[1]

(۵) الحلف بغیر اللہ (اوغیر اللہ) کی قسم کھانا بھی توحید کی روح کے خلاف ہے۔ یہ کوئی مختلف فیہ مسئلہ نہیں، بلکہ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ لیکن عوام بلکہ بعض خواص بھی اس آزار میں مبتلا ہیں اور تمام مسلم علاقوں میں انبیاء اور اولیاء کی قسمیں کھانے کا عام رواج ہے۔ اتنا عام کہ اگر آپ کسی کو منع کریں، تو ماننے کے بدلے الٹا آپ پر بد دینی، یا کم از کم "وہابیت" کا الزام تو لگا ہی دے گا، حالانکہ ترمذی کی روایت (من حلف بغیر اللہ فقد اشرک) میں حلف بغیر اللہ کو "شرک" کہا گیا ہے۔ اس سے زیادہ 'نہی' اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسی اصل کی بنا پر امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا:-

لا ینبغی لاحد ان یدعو اللہ الا بہ واکرہ ان یقول بمعاقد العز من عرشک او بحق خلقک۔

تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اللہ کے سوا غیر اللہ کی قسم کھانا یا اس کی دہائی دینا قطعاً ممنوع ہے۔ البتہ امام ابو یوسف بمعاقد العز من عرشک جائز رکھتے ہیں، کہ عرش پر عزت کی جگہ، کا مالک اللہ ہی ہے۔ اور معقد العز من عرشک

---

[1] الدر النضید صـ ۲۹۔

سے اللہ تعالیٰ ہی مراد ہو سکتا ہے۔ امام صاحب اس کو بھی مکروہ سمجھتے ہیں "بحق فلاں" کہہ کر اللہ سے مانگنا تو بہر حال سب کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا۔ دعاء غیر اللہ، استغاثہ لغیر اللہ، التوسل بالانبیاء والصالحین، استعاذۃ اور حلف بغیر اللہ، یہ سب کی سب ایک قسم کی چیزیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اندر 'شرک' کے جراثیم رکھتی ہے، اور توحید کی روح کے یکسر خلاف ہے۔ اس لئے یہ توہم پرستیاں دین خالص میں کبھی روا نہیں رکھی جا سکتیں۔ محمد بن عبدالوہاب کا قصور صرف اس قدر ہے کہ انھوں نے ان "مکروہات" سے سختی کے ساتھ روکا، اور کم از کم ایک خطے میں عوام تک کو اس کا پابند بنانے میں وہ کامیاب ہوئے۔

(۶) زیارۃ القبور: قبروں کی زیارت مشروع ہونے میں شک نہیں، بشرطیکہ زیارت کے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ مسلمان کے لئے انبیاء، صالحین، عام مسلمانوں کی بلکہ غیر مسلموں کی قبروں کی زیارت بھی جائز ہے۔ اُس کے لئے جو عبرت اور نصیحت حاصل کرنا چاہے۔ اور مسلمانوں کی قبروں کی زیارت سنت ہے (جس کی ترغیب بھی دی گئی ہے)، اُس کے لئے جو اہل قبر کے لئے دعا کرنا چاہے۔

محمد بن عبدالوہاب اور ان کے ماننے والے زیارت قبور کے منکر نہیں، البتہ وہ ان 'بدعات' کے سخت مخالف ہیں، جو قبروں کے پاس روا رکھی جاتی ہیں۔ وہ قبروں سے مرادیں مانگنے والوں، دعا کرانے والوں اور شفاعت چاہنے والوں کو روکتے ہیں اور آج کل قبروں کی زیارت نہیں ہوتی، بلکہ "بدعت فروشی" کی دوکانیں گرم ہوتی ہیں: صاحب قبر سے دعا مانگنا، اس کے واسطہ سے دعا مانگنا، یا قبر کے پاس

بہ نیت تقرب الی اللہ کھڑے ہو کر اپنے لئے دعا مانگنا۔ ان میں سے کوئی چیز جائز نہیں۔ اور موحدین ان ہی چیزوں سے روکتے ہیں۔

قبروں کے "مسجد بنانے" سے حدیثوں میں بار بار منع کیا گیا ہے۔ اس باب میں بے شمار صحیح مشہور حدیثیں ہیں۔ اور اسی بنا پر محمد بن عبدالوہاب کے ماننے والوں نے قبوں کے گرانے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ ایک چیز ناروا ہے۔ فرمان شریعت کے خلاف قبروں کو اوثان (بتوں) کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ یہ ایک منکر ہے، اگر طاقت ہو تو اس "منکر" کے مٹانے میں دریغ نہیں ہونا چاہیے۔

محمد بن عبدالوہاب کے جانشین پہلے فرماں روا نہیں، جنہوں نے قبوں کے انہدام پر توجہ کی ہو، بلکہ یہ امام شافعیؒ (۱۵۰-۲۰۴ھ) ہی کے زمانہ (دوسری صدی ہجری کا آخر) سے چلا آتا ہے۔ امام شافعی نے کتاب الام میں ذکر کیا ہے کہ "حکام قبروں کو ہدم کرتے تھے، اور فقہاء ان پر اعتراض نہیں کرتے"۔ نووی نے شرح "مسلم" میں بھی ان کا یہ قول نقل کیا ہے[1]

اسی طرح ابن حجر ہیثمی (ف ۹۷۴ھ) کی "الزواجر" میں بھی منقول ہے ابن حجر نے فقہاء کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

وتجب المبادرة لهدمها وهدم القباب التی علی القبور اذ هی اضر من مسجد الضرار - الخ

(ان) قبروں کو اور ان قبوں کو جو قبروں پر (تعمیر کئے گئے) ہیں، فوراً ہدم کر دینا

---

[1] الهدیة السنیة: حاشیہ از علامہ سید رشید رضا (ف ۱۳۵۳ھ) ص ۴۹

چاہیے اس لئے کہ یہ "مسجد مزار" سے بھی زیادہ خطرناک ہیں[۱]

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات آئینہ ہو گئی کہ شیخ محمد بن عبد الوہاب کسی نئے دین کی دعوت نہیں دیتے، نہ انہوں نے کوئی نیا فقہی مذہب ہی ایجاد کیا ہے۔ وہ خود امام احمدؒ بن حنبل (ف ۲۴۱ھ) کے مذہب پر ہیں۔ ان کی دعوت صرف "کتاب و سنت" کی دعوت ہے۔ وہ حنفیوں سے صرف یہ کہتے ہیں کہ وہ پکے حنفی ہو جائیں۔ یہی مطالبہ ان کا شافعیوں سے ہے۔ آج امام شافعیؒ (ف ۲۰۴ھ) کی قبر پر مصر میں جو کچھ کیا جاتا ہے، کیا اسے وہ کسی حالت میں روا رکھ سکتے تھے؟ یہی حال دوسرے ائمہ کا ہے۔ ان میں سے کوئی بدعات کا روادار نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ محمد بن عبد الوہاب کے پیرو مسلمانوں کو انہیں بدعتوں سے باز رہنے کی دعوت دیتے ہیں، اور جو بار بار فہمائش کے بعد بھی نہیں مانتا، اس کے ساتھ سختی سے بھی پیش آئے ہیں۔ ان کے اسی "تشدد فی العمل" کو نہ جانے کن کن فقہی گالیوں سے یاد کیا گیا ہے؟ اور اسی بنیاد پر محض قیاس آرائی سے کام لے کر بے بنیاد افترا پردازیاں بھی کی گئی ہیں۔ اس مختصر سی کتاب میں سینکڑوں صفحوں کی گالیوں اور بے شمار بہتانوں کی فہرست پیش کرنا بہت دشوار ہے۔ پھر بھی آئندہ صفحات میں غلط بیانیوں کے کچھ نمونے دیے جاتے ہیں۔

---

[۱] الزواجر: ج ۱ ص ۱۶۳ مطبوعہ مکتبہ مصر

پانچواں باب

غلط بیانیاں اور افتراپردازیاں

وہابیت سب سے بڑی غلط بیانی شیخ الاسلام کی دعوت کے متعلق یہ کی گئی کہ اسے "وہابیت" کا نام دیا گیا۔ اس طرح پر ارباب غرض نے یہ باور کرانا چاہا، کہ یہ اسلام سے الگ کوئی دین ہے۔ انگریزوں، ترکوں اور مصریوں نے مل کر اسے ایسا ہوّا بنایا کہ اسلامی دنیا میں پچھلی دو صدیوں میں جتنی تحریکیں پیدا ہوئیں اور یورپی طاقتوں نے ان سے کوئی خطرہ محسوس کیا، جھٹ اس کا ڈانڈا نجد کی وہابیت سے ملا دیا گیا۔ مغرب کی سنوسی تحریک، فقہ کی جزئیات میں نجدی دعوت سے بالکل الگ بلکہ متناقض ہے۔ تاہم اسے بھی شیخ ہی کی دعوت کا شاخسانہ بتایا جاتا ہے اور صرف اس لئے کہ سنوسی تحریک اپنی جہادی سرگرمیوں کے باعث اٹلی کے لئے ایک عرصہ تک خطرہ بنی رہی۔ ہندوستان کی تحریکِ تجدید جہاد، تو نجد سے اس طرح وابستہ کی گئی ہے، کہ غیر تو غیر، اپنے بھی دونوں کو ایک خیال کرنے لگے ہیں۔ اصلی ماخذ۔

(کتاب وسنّت) کے ایک ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن طریقِ کار اور اصولِ دعوت میں نمایاں فرق ہے۔ اور اصولی مماثلت کے باوجود اپنی جگہ پر یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ حضرت سید احمد شہید (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱) اور مولانا اسماعیل شہید (ش ۱۲۴۶ھ) کی تحریک تجدید و جہاد پر نجدی دعوت کا بالکل اثر نہیں پڑا[1]۔

بہرحال جہاں تک وہابیت کو ایک الگ مذہب اور گمراہ جماعت بنانے کی کوشش کی گئی ہے، یہ نام حد درجہ قابلِ اعتراض ہے ورنہ اس عام غلط بیانی اور بہتان تراشی سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے، تو اس نام میں کوئی مضائقہ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ تحریک اصلاح و تجدید کے داعی محمد بن عبدالوہاب کی طرف اگر نسبت کی جاتی تو ان کے پیرؤں کو "محمدی" کہنا چاہیے تھا اور ظاہر ہے کہ مخالفین کی غرض "محمدی" کہنے سے نہیں پوری ہو سکتی تھی۔ اس لئے وہ اس جماعت کی نسبت داعی تحریک کے والد ماجد شیخ عبدالوہاب کی طرف کرنے لگے۔ اور اس طرح پر یہ نام (وہابی اور وہابیت) مشہور ہوا۔ اور پھر یہ نسبت ایسی چل نکلی کہ بیسیوں مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے عبدالوہاب ہی کے سر تجدید و اصلاح کا سہرا باندھ دیا۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو براجس کی کتاب (ج ۲، ص ۱۳۴)۔

یہ صاحب[2] براجس (Brydges) تو اپنے زعم باطل میں یہاں تک لکھ

---

[1] اس مسئلے پر راقم کی "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" یہ مولانا سندھی کے افکار پر ایک نظر دیکھی جا سکتی ہے۔

[2] براجس کا ماخذ برک ہارٹ ہے، اس نے بھی عبدالوہاب ہی کو جماعت کا بانی قرار دیا ہے۔ (ج ۲، ص ۹۶)۔ یہ تو یہاں تک بڑھ گیا، کہ بنو تمیم کی ایک شاخ Wahhabia بھی اس نے وضع کر لی (ص ۹۷)

گئے کہ "صاحب دعوت کے بیٹے محمد نابینا (ضریر) تھے" (صہ ۱۳۴) غلط در غلط اسی کو کہتے ہیں، حالانکہ شیخ کے بڑے بیٹے حسین بن محمد بن عبدالوہاب (ف ۱۲۲۴ھ) نابینا تھے۔ ہندوستانی مجاہدین کے کرم فرما ولیم ولسن ہنٹر بھی اسی غلط فہمی میں بتلا ہیں۔

بہرحال یہ دو "مبصر" اکیلے نہیں۔ ایک جماعت کی جماعت اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ بادیہ عرب میں گھومنے والے یورپی سیاحوں کے پیش رو نی بور[2] نے بھی بانی جماعت کا نام عبدالوہاب ہی بتایا ہے اور کہتا ہے کہ "آج کل اس کے لڑکے محمد جانشین ہیں"۔ یہ واضح رہے کہ نی بور ۱۷۶۴ء میں (یعنی شیخ کی وفات سے ۲۸ برس پہلے) بلاد عرب میں موجود تھا۔ لیکن اس باب میں، سب سے دلچسپ غلط فہمی عیسائی مبلغوں کے سرغنہ پادری زویمر کو ہوئی ہے۔ عام شہرت کے مطابق وہ وہابی اور وہابیت کو الگ دین یا مذہب سمجھا۔ پھر اس نے امام ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کے افکار و آراء بھی "وہابیوں" سے ملتے جلتے دیکھے، جھٹ یہ اعتراض کر بیٹھا کہ دیکھو "یہ وہابی ہیں لیکن اپنے کو حنبلی کہتے ہیں[3]" اس غریب کو یہ خبر نہیں، کہ وہابیت کی اصطلاح تو ابن قیم کے چار پانچ سو برس بعد رائج ہوئی۔

گو ہمارے پاس اس کا قطعی ثبوت نہیں کہ پہلے پہل یہ نام کس نے رکھا، لیکن اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام مخالفوں نے شیخ کی زندگی ہی میں رکھ دیا تھا۔ مار گولیوتھ کا بھی

---

[1] صہ ۱۳۱ ؎ [2] المقتطف ، ج ۶۷، صہ ۱۹۵ ؎

[3] مقالہ "وہابیت" ؎

یہی خیال ہے ۔ گو وہ اس باب میں سند نہیں، لیکن دوسرے قرینے بھی اس کی تائید[1] میں ہیں : شیخ الاسلام کے ایک معاصر (غالباً) ملا عمران بن رضوان (ف ؟[2]) کے ایک قصیدے میں یہ 'لفظ' آیا ہے :

ان کان تابع احمد متوهبًا فانا المقر بانني وهّابي[3]

ایک مصری[4] معاصر کا بھی یہ خیال ہے کہ یہ نام مخالفوں نے ابتدائی لڑائیوں کے زمانے ہی میں استعمال کرنا شروع کر دیا تھا ۔

شیخ الاسلام کے یورپی معاصر نیبور[5] نے وہابیت کی اصطلاح استعمال نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت (۱۷۶۴ء) تک "وہابیت" کی اصطلاح رائج نہیں ہو سکی تھی ۔ البتہ وہ شیخ کی دعوت کو (New Religion) کہتا ہے، گو بعد آخر میں "عبدالوہاب" کے نئے مذہب کو "محمدیت کی اصلاح" سے بھی تعبیر کرتا ہے[6] ۔ شیخ کے

---

[1] داؤد بغدادی (ف ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء) نے بھی صلح الاخوان میں یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ (بحوالہ Notes on Mohammadanism؛ ص ۲۱۹) ؛

[2] افسوس کہ کوشش کے باوجود صحیح زمانہ کا پتہ نہیں چل سکا ۔ بعض قرینے بتاتے ہیں کہ یہ شیخ کے معاصر نہیں تھے ؛

[3] الهدية السنية ص ۱۱ ؛ [4] محمد حامد الفقی : ص ۶-۵ ؛

[5] سب سے پہلا یورپی سیاح جو ممالک عرب میں وارد ہوا (ملاحظہ ہو : باب 'ماخذ')

[6] ج ۲، ص ۱۳۳ ؛

تھوڑا عرصہ بعد دوسرے دو سیاحوں، (علی بیگ عباسی بادیا (۱۸۰۷ء) اور برک ہارٹ (۱۸۱۴ء) نے بھی نجدی تحریک اور دعوت سے بحث کی ہے۔ بادیا مصریوں کے قبضہ سے پہلے حجاز آیا تھا۔ افسوس کہ اس کا اصلی سفرنامہ دستیاب نہ ہو سکا۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ اس نے 'وہابی' کی اصطلاح استعمال کی ہے یا نہیں۔ ہوگارتھ[1] نے جو اقتباسات دیئے ہیں، ان سے صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ برک ہارٹ ۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ میں محمد علی مصری کے قبضے کے بعد حجاز آیا اور ۱۸۱۶ء میں اس نے "وہابیوں" سے متعلق یادداشت تیار کی، جو بعد کو دو جلدوں میں **Notes on the Bedouins and the Wahhabys** کے نام سے شائع ہوئی (۱۸۳۱ء)۔ اس نے "وہابی" کی اصطلاح بار بار استعمال کی ہے۔ کتاب مذکور کی دوسری جلد کے بہت کم صفحے اس لفظ (وہابی) سے خالی ہوں گے۔ اسی کے لگ بھگ عبدالرحمان جبرتی (ف ۱۲۳۸ھ) نے اپنی تاریخ مرتب کی، ان کے ہاں بھی وہابی کی اصطلاح بہ کثرت[2] استعمال ہوئی ہے۔ ۱۲۱۸ھ کے حوادث میں لکھتے ہیں:

"وحضر صحبة الحاج كثير من اهل مكة هروبا من الوهابي
ولغط الناس فى خبر الوهابي واختلفوا فيه"[3]

اس سے پتہ ملتا ہے کہ مصریوں کے حملہ حجاز کے وقت یہ اصطلاح عام ہو چکی تھی۔ بعد کے لکھنے والوں نے اس جماعت کو ہمیشہ وہابی ہی کے نام سے یاد کیا۔ ہم نے ابھی کہا ہے کہ صرف نام میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ نام (وہابی) اس

---

[1] صفحہ ۸۱-۸۲ ۔ [2] ملاحظہ ہو ج ۲ ص ۴۳۲، ۲۳۵، ۲۵۲، ۲۵۳ الخ ۔ [3] عجائب الآثار ج ۳ ص ۵۵

طرح پر مشہور کیا گیا، کہ یہ گویا اسلام سے الگ کوئی مذہب ہے۔ اور یہی وجہ شکایت ہے اور اسی لئے غلط بیانیوں کی فہرست میں ہم نے اس نام کو سب سے اونچی جگہ دی ہے۔

سب سے پہلا مفتری

سب سے پہلے سلیمان[1] بن محمد بن سحیم (ف ۱۱۸۱ھ) نے شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں غلط باتیں منسوب کرنا شروع کردی تھیں[2] اس نے دنیائے اسلام کے نام لمبی گشتی چٹھی میں حسب ذیل الزام لگائے ہیں:-

جبیلہ میں زید بن خطاب کی قبر کا انہدام، قبر کے پاس ایک مسجد کا انہدام، دلائل الخیرات اور روض الریاحین کو نذر آتش کرنا، ابن فارض اور ابن عربی کی تکفیر۔

سو زید اور ان کے ساتھیوں کی قبروں کا پتہ ہی نہیں۔ دلائل الخیرات اور روض الریاحین کے جلانے کی خبر بہتان ہے۔ البتہ ان کتابوں کے پڑھنے سے شیخ نے ضرور منع کیا تھا۔ ابن عربی، ابن فارض اور ان جیسے متصوفین کی تکفیر شیخ سے منقول ہے:-

---

[1] پورا نام سلیمان بن محمد بن احمد بن علی بن سحیم ہے۔ اس کا باپ محمد بن احمد بھی دعوت کے مخالفوں میں تھا (روضۃ: ج ۱ ص ۳۸؛ السحب: ص ۳۱۳)۔

[2] یہ چٹھی روضۃ الافکار: ج ۱ ص ۳۱ - ۴۲ میں پوری نقل کی گئی ہے۔ نیز روضۃ الافکار ج ۱ ص ۳۷۔

وقد کفر الشیخ ابن العربی وابن الفارض واشالہما[1]

دوسرے معاصر اور ان کی گالیاں

شیخ الاسلام کے بعض دوسرے معاصروں نے بھی ابن تیمیم کا ہاتھ بٹایا، لیکن ان کی کتابوں میں گالیوں اور افترا پردازیوں کے سوا کچھ نہیں۔ ان مخالفوں میں احمد بن علی بصری قبانی[2] (ف ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۴ء)، محمد بن عبدالرحمان بن عفالق احسائی[2] حنبلی (ف ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۹ء)، عبداللہ بن عیسیٰ مُویس (ف ۱۱۷۵ھ) اور ابن فیروز (ف ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء) زیادہ نام آور ہیں۔ ان صاحبوں کے بعد دوسری صف میں عفیف الدین عبداللہ بن داؤد زبیری حنبلی (ف ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء)، احمد عبداللہ الحداد باعلوی تریمی شافعی[3] کے نام آتے ہیں۔ مآخذ اور لٹریچر کے ضمن میں ان کتابوں کا ذکر کیا جائے گا۔ ابن غنام نے بھی ان میں سے اکثر کا ذکر کیا ہے[4] اور ابن فیروز کی ایک نظم کا جواب بھی دیا ہے۔ اب رہی ان صاحبوں کی گالیاں، سو ان کے نقل کی ہمت نہیں، پھر بھی ان کی شرافت اور حسنِ اخلاق کے اظہار کے لئے ایک اقتباس کی اجازت چاہتا ہوں، اہل علم سے معذرت خواہ ہوں۔

عبداللہ بن داؤد زبیری (ف ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کی کتاب الصواعق والرعود[5] کے آغاز

---

[1] روضۃ الافکار، ج ۱: ص ۱۷۶، ۱۵۸، ۱۹۸۔ [2] ان صاحبوں کے صحیح سال وفات نہ معلوم ہو سکے۔ یہ سنین کتاب کی تالیف کے ہیں۔ یا یہ کہ ان سنین میں ان کا موجود ہونا ثابت ہے۔

[3] صحیح سال وفات نہ معلوم ہو سکا۔ تیرھویں صدی ہجری میں موجود ہونا ثابت ہے۔

[4] روضۃ الافکار، ج ۱، ص ۲۰۹؛ ج ۲: ص ۲۱۴۔ [5] مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ، پٹنہ: ع ۲۳۸۔

میں دو تقریظیں ہیں۔ پہلی تقریظ محمد بن فیروز حنبلی (ف ۱۲۱۶ھ) کی لکھی ہوئی ہے (مورخہ ۱۸؍صفر ۱۲۱۰ھ)

اس تقریظ کے آغاز ہی میں حسب ذیل عبارت پر نظر پڑتی ہے، جسے دیکھ کر شاید شرم و حیا بھی پانی پانی ہو جائے۔ 'نقلِ کفر کفر نہ باشد' ایک بار ذرا جی کڑا کر کے ملاحظہ کر لیجئے:

"... بل لعل الشیخ [یعنی عبد الوهاب] غفل عن مواقعة أمه [یعنی محمد بن عبد الوهاب] فسبقه الشیطان الیها فکان اباهذا المارد[1] الخ"

کیا لکھنؤ کی بھٹیارنیں اس سے زیادہ بھونڈی گر سکتی ہیں؟ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ تحریر ۱۲۱۰ھ کی ہے۔ ابنِ غنام ۱۲۱۱ھ کے حوادث میں، الخبیث ابنِ فیروز کی ایک نظم کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"وقد وصل الینا من هاتیك الدیار منظومة لابن فیروز .... متضمنة لاقبح العار الخ"[2]

(اس نواح سے ابنِ فیروز کی ایک ایسی نظم موصول ہوئی ہے، جس میں انتہائی شرمناک باتیں درج ہیں)

جس سے پتہ چلتا ہے کہ فحش گوئی ان صاحب کی سرشت میں داخل تھی۔

غلط بیانیوں کے نمونے

(الف) ادعاء نبوت: شیخ کی دعوت کے مخالفوں کو جب حرف رکھنے کا موقع نہیں ملتا، تو وہ کہتے

---

[1] اس عبارت کے ترجمہ پہ طبیعت کسی طرح آمادہ نہ ہو سکی۔ [2] ج ۲، ص ۲۱۴۔

"کہ اصل میں یہ نبوت کا دعویٰ کرنا چاہتے تھے، لیکن اخفاء سے کام لیا"۔[1]

اسی الزام کو احمد زینی دحلان (۱۲۳۲ھ، ۱۳۰۴ھ) ان لفظوں میں دہراتے ہیں:

والظاهر من حال محمد بن عبد الوهاب انه یدعی النبوة الا انه ما قدر علی اظهار التصریح بذلک۔[2]	اور محمد بن عبد الوہاب کے حالات سے یہ پتہ لگتا تھا، کہ وہ نبوت کا دعویٰ رکھتے ہیں، لیکن اس کے صاف صاف اعلان کی جرأت نہ ہوئی۔

حیرت ہے کہ فی بور نے بھی سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر کے لکھ دیا، کہ "عبدالوہاب (؟) رسولوں کو بڑا آدمی سمجھتا تھا، لیکن وہ الہام یا فرشتوں کے ذریعہ وحی کا قائل نہیں تھا"۔[3]

اس سلسلے کا ایک اور شرمناک نمونہ ہمیں راونشا (Ravenshaw) کی اُس یادداشت[4] میں ملتا ہے، جو اس نے پٹنہ کے کلکٹر کی حیثیت سے مولانا احمد اللہ صادق پوری[5] کے مقدمے میں لکھ کر دی تھی:۔

---

[1] مصباح الانام (مخطوط) ورق ۵-۶ ؛ [2] الدرر السنیۃ، ص ۴۶ ؛ [3] سفرنامہ فی بور ۲۰، ۱۳۴ ؛

[4] کلکتہ گزٹ: ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء، ضمیمہ ص ۴۵-۴۷ ؛

[5] مولانا احمد اللہ صادق پوری خاندان صادق پور پٹنہ کے ممتاز فرد اور حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں منسلک تھے۔ آپ پر ۱۲۱۸ھ / ۱۸۶۵ء میں سازش کا مقدمہ چلا۔ ہائی کورٹ سے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ تقریباً سترہ برس انڈمان میں رہ کر وہیں وفات پائی (ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ = نومبر ۱۸۸۱ء) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک ؛

"اس مصلح کا خیال تھا کہ کبھی کسی انسان کو براہِ راست اللہ کی طرف سے الہام نہیں ہوا، اور کوئی مقدس کتاب ایسی وجود میں نہیں آئی، جسے الہامی (Divine) کہہ سکیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عبدالوہاب(؟) کے خیال کے مطابق کوئی مذہب الہامی ہوا ہی نہیں۔ اور اگر وہ 'محمدی' مذہب کو الہامی کہتا ہے، تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے براہِ راست آیا تھا، بلکہ صرف اس کی کاملیت کی وجہ سے"۔

پھر مزید ارشاد ہوتا ہے:۔

"اصلاح یافتہ مسلمان (محمڈن) کی ان بدوؤں میں خوب پذیرائی ہوئی جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی ایک برگزیدہ آدمی نہیں تسلیم کیا، اور نہ وہ قرآن کو الہامی کتاب مانتے تھے"۔

۱۸۶۵ء میں ہمارے ضلع کے اس کلکٹر کی یہ یادداشت اسی قسم کی جہالت کے نمونوں سے بھری پڑی ہے۔ مجاہدین ہند کے مشہور کرم فرما سر ولیم ولسن ہنٹر (W W Hunter) بھی اپنی کتاب[1] میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"بدوؤں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی برگزیدہ انسان نہیں تسلیم کیا تھا اور نہ قرآن کو الہامی کتاب" الخ

غالباً ان کا ماخذ مسٹر راونشا کی یہی یادداشت ہے۔ اور ہو سکتا ہے، کہ ان

---

[1] The Indian Mussalmans: ص ۵۶ - ۵۵

دونوں کا ماخذ نی بور کا سفرنامہ ہو، کہ یورپ کو اس جماعت کے متعلق پہلی اطلاع اسی کے ذریعہ ملی۔

(ب) انکارِ حدیث

زمانہ کی بوالعجبی بھی دیدنی ہے۔ وہ شخص جس کا اوڑھنا بچھونا سنت رسول ہو، اس پر انکارِ حدیث کا الزام رکھا جاتا ہے۔ اس بہتان تراشی کا سہرا بھی مصباح الانام کے مصنف احمد عبداللہ الحداد باعلوی کے سر ہے[1]۔ اس سے زیادہ عجیب تر یہ ہے کہ اس بے سر و پا بہتان کو ہمارے ملک کے ایک مشہور[2] اہل قلم (عبداللہ یوسف علی) نے اس بیسویں صدی میں پھر دہرایا ہے:-

"........ اور (کرامت علی) احادیث پر یقین رکھتے ہیں جنہیں وہابیوں نے مسترد کر دیا تھا۔"

---

[1] کتاب مذکور، ورق ۵۰۶

[2] یہ کچھ ان صاحب ہی پر موقوف نہیں، ہمارے ملک کے عالم و تعلیم یافتہ سب ایسی ہی بے سر و پا باتیں اس جماعت کے متعلق لکھتے رہے ہیں، ان سب کے پیش رو ایک بزرگ مولوی فضل رسول بدایونی (ف ۱۲۹۸ھ / ۱۸۷۲ء) نے ایک کتاب تصحیح المسائل در تردید فرقہ نجدیہ اراذل، لکھی ہے، جو خرافات کا مجموعہ ہے۔ ابھی ایک معاصر نے اپنی کتاب (آثار جمال الدین) میں بھی اس جماعت کے متعلق بے سر و پا باتیں لکھ دی ہیں (ص ۳۳۶-۳۳۷)۔ یہ دو صفحوں کا پورا بیان غلطیوں اور غلط فہمیوں کا افسوسناک مجموعہ ہے۔ حد یہ ہے کہ ان کے ہاں "سنوسیوں اور نجدی وہابیوں کے عقائد کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں (ص ۳۳۹)

"وہ قدیم اور صوفی عقائد کے حامی ہیں[1]"

یہ ہے ہمارے مترجم قرآن کی واقفیت ایک اسلامی جماعت کے متعلق تاب آیئے ہم آپ کو عبرت اور تقابل کے لئے ایک متعصب پادری کا بیان سنائیں۔ ہیوجز (Thomas Patric Hughes) وہابی اور پروٹسٹنٹ جماعتوں کا باہمی مقابلہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے:۔

"وہابیت کو بسا اوقات، اسلام کا پروٹسٹنٹ فرقہ بتایا جاتا ہے ...... اگرچہ بڑا فرق یہ ہے کہ عیسائی پروٹسٹانیت مقدس الہامی کتابوں کی اعلیٰ حیثیت تسلیم کرتے ہوئے روایتی تعلیمات کو مسترد کرنا بھی ضروری خیال کرتی ہے، اس کے برعکس وہابیت قرآن کے ساتھ ساتھ حدیثوں پر بھی زور دیتی ہے[2]"

(ج) تکفیر و قتال مسلمین شیخؒ اور ان کے ماننے والوں پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ تمام اہلِ قبلہ کی تکفیر کرتے ہیں اور مسلمانوں سے قتال جائز سمجھتے ہیں۔ یہ الزام مختلف وقتوں میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ خود شیخ کی زندگی میں بھی یہ الزام رکھا گیا تھا، اور انہوں نے خود بھی اس کی صاف صاف تردید کی تھی۔ ملاحظہ ہو:

واذا کنا لا نکفر من عبد الصنم	اور جب ہم ان لوگوں کی تکفیر نہیں کرتے، جو
الذی علی قبۃ عبد القادر	جہالت اور عدم تنبیہ کے سبب سے ان بتوں

---

[1] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ: صہ ۱۹۲ [2] ڈکشنری آف اسلام صہ ۶۶۱

والصنم الذي على قبر احمد البدوي وامثالهما لاجل جهلهم وعدم من ينبههم، فكيف نكفر من لم يشرك بالله او لم يهاجر الينا ولم يكفر . . . . سبحانك هذا بهتان عظيم۔

کی پرستش کرتے ہیں، جو (شیخ) عبدالقادر اور (شیخ) احمد بدوی اور ان جیسے بزرگوں کی قبروں پر بنے ہوئے ہیں، تو پھر ہم ان لوگوں کی تکفیر کس طرح کر سکتے ہیں، جنہوں نے شرک کا ارتکاب نہیں کیا، یا ہجرت کر کے ہمارے پاس نہیں آئے اور کسی کفر کے مرتکب نہیں ہوئے ——— سبحان اللہ! یہ صریح بہتان ہے۔

لیکن ان تردیدوں کے باوجود یہ الزام مختلف رنگ آمیزیوں کے ساتھ ساتھ بار بار دہرایا گیا ہے۔ دو تین مثالیں پیش ہیں:

ابن عابدین شامی (ف ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء) اپنے مشہور حاشیہ رد المحتار میں فرماتے ہیں:

كما وقع في زماننا في اتباع عبدالوهاب [؟] الذين خرجوا من نجد وتغلبوا على الحرمين وكانوا ينتحلون مذهب الحنابلة لكنهم اعتقدوا انهم المسلمون وان من خالف اعتقادهم مشركون واستباحوا قتل اهل السنة وقتل علمائهم "اهـ" [1]

جیسا کہ ہمارے زمانے میں عبدالوہاب [؟] کا حال ہوا، لیکن ان کا اعتقاد تھا کہ صرف یہی مسلمان ہیں، اور ان کے اعتقاد کے مخالف سب مشرک ہیں، اور اسی بنیاد پر انہوں نے اہل سنت اور ان کے علماء کا قتل روا رکھا۔

---

[1] رد المحتار ج ۳ ص ۳۰۹

احمد زینی دحلان (ف ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء) کو تو اس جماعت سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ اس نے بار بار اس الزام کو دہرایا ہے[۱]

ہمارے ملک کے نامور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خان (ف ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء) بھی اس جماعت کے بارے میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ ان کی مختلف کتابوں[۲] میں اس جماعت کے متعلق الجھے ہوئے بیانات ہیں۔ البتہ اتحاف النبلاء میں ان کا بیان ایک حد تک اچھا اور حقیقت سے قریب تر ہے۔ پھر بھی غیر مشروط "تکفیر" کا الزام اس میں موجود ہے[۳]۔ اور تو اور یمن کے نامور عالم اور محقق، قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ) کو بھی اس باب میں اہلِ نجد کے مسلک کی صحیح صحیح اطلاع نہیں مل سکی تھی، جس کے وہ خود بھی شاکی ہیں:-

ولکنهم یرون ان من لم یکن	لیکن ان کا خیال ہے کہ جو امیر نجد کے
داخلاً تحت دولة صاحب نجد و	دائرہ اطاعت سے باہر ہے وہ
ممتثلاً لاوامره خارج عن الاسلام	اسلام سے خارج ہے۔
وتبلغ عنهم اشیاء اللہ اعلم	ان کے بارے میں اور بھی طرح طرح کی باتیں
بصحتها ....[۴]	سننے میں آتی ہیں۔ اللہ جانے کہاں تک صحیح ہیں؟

---

[۱] الدرر السنیۃ، ص ۴۲، ۵۰، ۵۴؛ خلاصۃ الکلام، ص ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۲

[۲] ترجمان وہابیہ، ہدایۃ السائل، موائد العوائد، التاج المکلل وغیرہ

[۳] ص ۴۱۳ ۔ [۴] البدر الطالع: ج ۲ ص ۶ ۔

پھر آگے چل کر "نماز یا جماعت ترک کرنے والوں سے قتال" کی مخالفت کرتے ہیں، لیکن تارک صلوٰۃ کی تکفیر جائز رکھتے ہیں[1]۔

اہلِ نجد پر تکفیر اہلِ قبلہ کا الزام اگر مخالفوں نے رکھا، تو اس کی ایک طرح پر اصلیت بھی ہے اور اس میں معمولی لکھے پڑھے لوگوں کے لئے التباس کی گنجائش ہے۔ ہم یہاں پر اہلِ نجد کی زبان میں ان کا مسلک بیان کر دیتے ہیں، جو کوئی نیا مسلک نہیں، بلکہ حنابلہ اور ظواہر کا مشہور مسلک ہے۔

شیخ الاسلام کے شاگرد، احمد بن ناصر بن عثمان معمری نجدی (ف ۱۲۲۵ھ) نے ۱۲۱۱ھ میں علمائے حرم شریف کے سامنے جو تین مسئلے پیش کئے تھے، ان میں سے دوسرے کا خلاصہ ان کی زبان میں یہ ہے:-

اما من قال لا الٰہ الا اللہ	جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے کے
محمد رسول اللہ وھو مقیم علیٰ	بعد بھی شرک پر قائم ہے، مردوں سے دعائیں مانگتا،
شرکہ یدعو الموتیٰ ویسألھم	ان سے ضرورتوں کے پورا کرنے اور مصیبتوں
قضاء الحاجات وتفریج الکربات	کے دور کرنے کی درخواست کرتا ہے، تو
فھذا کافر مشرک حلال الدم	تو وہ کافر اور مشرک ہے۔ اس کا خون اور
والمال، وان قال لا الٰہ الا اللہ	مال حلال ہے، اگرچہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد
محمد رسول اللہ وصلّی وصام	رسول اللہ کہتا ہے، نمازیں پڑھتا، روزے
وزعم انہ مسلم	رکھتا اور اپنے کو مسلمان بھی سمجھتا ہے۔

---

[1] البدر الطالع ج ۲ ص ۵

اسی رسالے میں ابن معمر نجدی نے سستی سے نماز ترک کرنے والوں سے بھی قتال کو جائز رکھا ہے، اور زہری اور امام ابو حنیفہ کے علاوہ تمام ائمہ کا اجماع نقل کیا ہے۔[1] تفصیل میں پڑنے کی گنجائش نہیں، حنابلہ کا یہ مشہور مسلک ہے، اور اسی پر اہلِ نجد عامل ہیں۔ تارک صلوٰۃ کا "کفر" ان کے نزدیک محقق ہے[2]:

وَمَن لا یُصَلِّ، فَهُوَ لا شكَّ كافرٌ   كما قال المعصومُ أكملُ سيّدِ

اور جو نماز نہیں پڑھتا، وہ بے شک کافر ہے   جیسا کہ سرورِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے

تارک صلوٰۃ کے بعد قبر پرستوں (عُبّادِ قبور) کا مسئلہ آتا ہے۔ شیخ کے پیش رو اور ہم مشرب معاصر محمد بن اسماعیل الامیر یمنی (ف ١١٨٢ھ) بُت پرستوں (عُبّادِ اصنام) اور قبر پرستوں کے درمیان بالکل فرق نہیں کرتے[3]۔ شوکانی نے ان کا "رجوع" نقل کیا ہے اور عُبّادِ قبور پر اس تشدد کی سخت مخالفت کی ہے[4]۔ سلیمان بن سحمان نے اس "رجوع" کی پُر زور تردید کی ہے[5]۔ اور یہی قرین قیاس ہے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب بھی محمد بن اسماعیل الامیر کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ شیخ الاسلام "اتمام حجت" شرط قرار دیتے ہیں، اور اسی لئے تمام مسلمانوں کی تکفیر نہیں کرتے۔

۱۔ تفصیل کے لئے الہدیۃ السنیۃ ص ٦٦-٨٦   ۲۔ الہدیۃ السنیۃ، ص ١٠٥؛

۳۔ تطہیر الاعتقاد: ص ١٢؛   ۴۔ الدر النضید، ص ٣٥-٤٠؛

۵۔ تبرئۃ الشیخین الامامین: ص ٨٢-٨٣؛

ومن جملة هذه الاکاذیب ما ذکرہ ...... ان شیخ الاسلام محمد بن عبد الوهاب رحمه الله یسفك الدماء وینهب الاموال ویتجاری علی قتل النفوس ...... وتکفیر الامة المحمدیة فی جمیع الاقطار وهذا کله کذب[1]

انہیں افترا پردازیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب خون بہاتے ہیں اور مال لوٹتے ہیں اور لوگوں کے قتل کی جسارت کرتے ہیں اور تمام دنیا کے مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں ...... یہ سب سراسر جھوٹ ہے۔

اس عمومی تکفیر کی اہل نجد پرزور تردید کرتے ہیں، لیکن، اتمام حجت اور تبلیغ کے بعد تکفیر اور قتال کے قائل نظر آتے ہیں:

فلم یکفر رحمه الله الا عبّاد الاوثان من دُعاة الاولیاء والصالحین وغیرهم ممن اشرك بالله وجعل له اندادًا بعد اقامة الحجة ووضوح المحجة وبعد ان بدؤوهم بالقتال فحینئذ قاتلهم وسفك دماءهم ونهب اموالهم ومعه الکتاب والسنة واجماع سلف الامة.[2]

تو شیخ رحمہ اللہ نے صرف ان صنم پرستوں کی تکفیر کی، جو اولیاء اور نیکوکار بندوں سے مرادیں مانگتے ہیں، جنہوں نے حجت کے ثبوت اور طریق حق کی وضاحت کے بعد بھی شرک کا ارتکاب اور اللہ کا شریک ٹھہرایا، اور پھر انہوں نے قتال میں بھی پیش قدمی کی، تب شیخ نے ان سے قتال کیا اور ان کا خون بہایا اور ان کا مال لوٹا، اس حال میں کہ کتاب، سنت و اجماع، سب کی شہادتیں ان کی تائید میں ہیں۔

---

[1] تبرئة الشیخین الامامین ص ۵۸۔ [2] تبرئة الشیخین الامامین ص ۸۶

یہاں اتمام حجت کے علاوہ ایک دوسرا عذر بھی ہے اور وہ یہ کہ مخالفوں نے قتال کی ابتدا کی۔ ایک دوسری جگہ شیخ کا یہ قول منقول ہے:-

فجنس هؤلاء المشركين وامثالهم	تو یہ اور ان جیسے مشرک جو ولیوں اور
ممن يعبد الاولياء والصالحين	نیکوکار بندوں کی پرستش کرتے ہیں، ان کے
نحكم بانهم مشركون ونرى	بارے میں ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ تبلیغ حجت قائم
كفرهم اذا قامت عليهم الحجة	ہو جانے کے بعد ہم ان پر شرک کا حکم لگاتے
الرسالية -	ہیں اور ان کو کافر سمجھتے ہیں -

ان اقتباسات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شیخ اور ان کے پیرو تکفیر، اور قتال کے لئے تبلیغ اور "اقامت حجت" شرط قرار دیتے ہیں - اسی لئے عمومی تکفیر کے الزام کی یہ پرزور تردید کرتے ہیں - البتہ قبر پرستی اور ظاہری مشرکانہ اعمال کو یہ صرف "کفر عملی" نہیں سمجھتے، جیسا کہ عام طور پر "کفر عملی" اور "کفر اعتقاد" کے درمیان فرق کیا جاتا ہے -

یہ "توحید ربوبیت" کو کافی نہیں سمجھتے، بلکہ "توحید الوہیت" کو بھی اسلام کے لئے ضروری اور بنیادی شرط قرار دیتے ہیں - اللہ کو صرف "خالق" اور "مدبر کائنات" سمجھنے سے نجات نہیں ہو سکتی - "توحید ربوبیت" کے تو اہل جاہلیت بھی قائل تھے - البتہ وہ "الوہیت" میں شریک کرتے تھے، اور اسی لئے وہ ہر شجر، حجر کو جس کی وہ پرستش کرتے، "الٰہ" ہی کے نام سے موسوم کرتے - اس زمانے کے جاہلوں اور مشرکوں نے غیر اللہ کو الٰہ کہنے سے تو پرہیز کیا، لیکن

الوہیت کے تمام لوازم (نذر، دعا، طواف، قربانی وغیرہ) غیر اللہ کے لئے بھی عام کر دیئے۔ اور اس کا نام توسل یا استشفاع رکھ دیا، تو نام رکھنے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔[1]

یہ ہے خلاصہ شیخ کے مسلک کا۔ جماعت کی کتابوں میں اس مسئلے کی پوری پوری وضاحت کی گئی ہے۔ سلیمان بن سحمان کی تبرئۃ الشیخین الامامین (ص ۲۱۵-۲۱۲) تو اسی کے لئے وقف ہے۔ خاتمے کے ضمن میں دوسری کتابوں کا ذکر آتا ہے تفصیل کے لئے ان کی طرف رجوع کرنا مناسب ہوگا۔ یہاں پر صرف ایک بات ذہن نشین کر لینا چاہیئے، کہ اہل نجد مسلمانانِ عالم کی عمومی تکفیر نہیں کرتے، بلکہ صرف ان لوگوں کی جو مشرکانہ اعمال میں گرفتار ہیں۔ اور تبلیغ و دعوت کے بعد بھی اپنی گمراہی سے باز نہیں آتے، اور ایسے لوگوں سے قتال بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ شیخ نے اپنی مختلف کتابوں میں اس حقیقت کو بار بار دہرایا

---

[1] "تبرئۃ الشیخین الامامین" کے حاشیہ میں ایک جگہ پر (ص ۱۲۴) علامہ سید رشید رضا مرحوم (ف ۱۳۵۲ھ) نے ایک عجیب بات لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل جاہلیت زبان کے صحیح ذوق کی وجہ سے اپنے ہر معبود (شجر ہو یا حجر) کو الٰہ ہی کہتے تھے۔ اس لئے کہ اس لفظ کے صحیح معنی یہی ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے زمانے کے مشرک لغت اور زبان سے نا واقفیت کی وجہ سے یہ سمجھے کہ اسلام غیر اللہ کو الٰہ کہنے سے روکتا ہے، ورنہ عبادت کی تمام باتیں (مردوں سے مرادیں مانگنا، نذر، قربانی، قبروں کا طواف) ان کے نزدیک توحید کے منافی نہیں۔ تو اس طرح پر مشرکین جاہلیت نے صرف دین پر ظلم کیا اور اس زمانے کے مسلمان مشرکوں نے دین اور زبان دونوں پر ظلم کیا (وِلِذَالِکَ قُلْتُ اِنَّ مُشْرِکِی المسلمین قد جنوا علی الدین و اللغۃ العربیۃ و مشرکی الجاھلیۃ حافظوا علی لغتھم فسموا الکل بشیء باسمہ)۔

۔ ۔ اور حضرت ابوبکر رضؓ کے قتال مانعین زکوٰۃ سے بار بار استدلال کیا ہے [1]۔

مندرجہ بالا اقوال واقتباسات میں جہاں تردید ہے، وہ اسی عمومی تکفیر کی تردید ہے۔ اور جہاں اعتراف ہے، وہاں اتمامِ حجت اور تبلیغ کے بعد بھی مشرکانہ اعمال پر اصرار کرنے والوں سے متعلق ہے۔

اگر الزام عائد کیا جائے اور اس کا منشا بھی بتا دیا جائے، تو انسان غور کر سکتا ہے، اور ممکن ہو تو غلط فہمی کے ازالے کی بھی کوشش کی جا سکتی ہے۔ لیکن خواہ مخواہ کی بدگمانی اور بے بنیاد غلط بیانی پر تو صرف اظہارِ افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوا کہ اِس دور میں بھی ہمارے ملک کے بعض مشہور علماء شیخ محمد بن عبدالوہاب کے متعلق عجیب و غریب خیال رکھتے تھے۔ مولانا سید انور شاہ کشمیری (ف ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء) جیسے عالم کا شیخ کے متعلق یہ لکھنا:۔

اما محمد بن عبد الوہاب النجدی فانہ کان رجلا بلیدا قلیل العلم فکان یتسارع الی الحکم بالکفر [2]۔	اور محمد بن عبدالوہاب نجدی تو ایک کم علم اور کم فہم انسان تھا، اور اسی لئے کفر کا حکم لگانے میں اُسے کوئی باک نہیں تھا۔

تو حد درجہ افسوس ناک اور تکلیف دہ ہے۔ حیرت ہے کہ "کتاب التوحید" کے مصنف کو مولانا سید انور شاہ صاحب نے "بلید" اور "قلیل العلم" کہنے کی جرأت کیسے کی ؟ جس سے روحِ حق آگاہ

۱؎ اربع قواعد، روضۃ الافکار ج ۱ ص ۱۸۴، ۱۸۵؛ ج ۲ ص ۳۶؛ ۲؎ فیض الباری ج ۱ ص ۱۷۱

کی کوششوں سے ایک پورا خطۂ ارض اصلاح پذیر ہوگیا اور آج دو سو برس کے بعد اسی راہ پر گامزن ہے، اُسے "بلیہ" کہنے کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے؟

۵۔ عام غلط بیانی

شیخ اور ان کے ماننے والوں کے متعلق طرح طرح کی بے بنیاد باتیں شروع ہی سے کہی جانے لگی تھیں۔ شیخ الاسلام کے صاحبزادے شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب کے اس رسالے میں بھی جو انہوں نے ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں اہل مکہ کے لئے لکھا تھا، اس قسم کی غلط بیانیوں کی تردید کی گئی ہے[1]

واما ما یکذب علینا سترا للحق	اور یہ جو حق پوشی کی راہ سے ہمارے
..... بانا نفسر القرآن برأینا	متعلق جھوٹ جھوٹ کہا جاتا ہے کہ
ونأخذ من الحدیث ما وافق فهمنا	ہم قرآن مجید کی تفسیر اپنی رائے سے
..... وانا نضع من رتبة نبینا	کرتے ہیں اور حدیث نبوی سے وہی
صلے اللہ علیہ وسلم بقولنا: النبی	حصہ لیتے ہیں جو ہمارے فہم (اور ذوق)
رمة فی قبرہٖ وعصا احدنا	کے مناسب ہو، اور یہ کہ رسول کریم
انفع منہ، ولیس لہ شفاعة وان	صلی اللہ علیہ وسلم کی شان گھٹانے
زیارتہٗ غیر مندوبة ..... و	کے لئے النبی رمة فی قبرہٖ (نبی کریم
انا مجسمة وانا نکفر الناس	قبر میں ایک بوسیدہ ہڈی سے زیادہ نہیں)

---

[1] آلوسی نے تاریخ نجد (ص ۴۵) میں اور نواب صدیق حسن خاں صاحب نے اتحاف النبلا (ص ۴۱۴۔۴۰۶) میں رسالے کا یہ حصہ پورا پورا نقل کیا ہے۔

علی الاطلاق..... فجمیع ھذہ الخرافات واشباھھا .... کان جوابنا فی کل مسألۃ من ذلك سبحانك ھذا بھتان عظیم۔ ہ

(الھدیۃ السنیۃ ص۴۶)

اور عصا احدنا انفع منہ (ہم میں سے کسی ایک کی چھڑی ان سے زیادہ نفع بخش ہے) جیسے (گستاخانہ) فقرے کہا کرتے ہیں؛ اور یہ کہ رسولِ کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کو شفاعت کا حق نہیں ہوگا! اور یہ کہ قبرِ اطہر کی زیارت مستحب نہیں ہے؛

.... اور یہ کہ ہم تجسیم کے قائل ہیں؛ اور یہ کہ ہم تمام لوگوں کی علی الاطلاق تکفیر کرتے ہیں؛ تو ان سب اور ان جیسی دوسری بے سروپا باتوں میں سے ہر ایک کے متعلق ہمارا جواب سبحانك ھذا بھتان عظیم، کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۵۔ انہدام قبہ نبویؐ

مخالفوں نے ایک بے بنیاد الزام یہ بھی تراشا کہ سعود بن عبد العزیز بن محمد بن سعود (۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء – ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء) نے قبہ نبوی کو بھی منہدم کرا دیا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ یورپی مورخوں نے خواہ مخواہ اس بے سروپا افسانے کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ سٹاڈرڈ (ج ۱ ص۲۷)؛ جیوجز ـــــ (ڈکشنری آف اسلام، ص۶۶۰) زویمر (ص۱۹۵)؛ بلنٹ (فیوچر آف اسلام، ص۴۵) مارگولیوتھ (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس، ج۱۲، ص۶۶۱) اور ان کے علاوہ ایک جماعت ہے، جس نے اس بے بنیاد الزام کو موقع بے موقع دہرانے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ یہ بالکل بے بنیاد اور سرتاپا افترا ہے۔ اس کی تعمیر کے متعلق ان کا جو کچھ بھی خیال ہو، لیکن قبۃ الرسولؐ کی طرف بری نگاہ سے دیکھنے کی بھی انہوں

نے کبھی جرأت نہ کی۔ عام قبوں کے انہدام اور زر و جواہر کی تقسیم کا وہ خود خوشی ذکر کرتے ہیں، لیکن یہ الزام واقعی بہتان ہے اور قبۃ الرسول [۳] کے ساتھ سوءِ ادب کی روایت یکسر بے بنیاد اور افترا ہے -

برانجس (جو اہلِ نجد کے دورِ عروج میں بصرہ اور بغداد میں رہ چکا ہے) اس افترا کی تائید تو نہ کر سکا، لیکن اہلِ نجد کی نیت پر حملہ کرنے سے باز نہیں رہا، وہ لکھتا ہے:

"اس نے (سعود بن عبد العزیز) قبہ شریفہ کے انہدام کا بھی ارادہ کیا [لے]، لیکن غالباً قبے کے استحکام یا منہدم کرنے والے آلات کی کمی کے باعث ایسا نہ کر سکا، اور قبہ محفوظ رہ گیا۔"

ان برانجس صاحب کی شخصیت اور ان کے بیان کی اہمیت تو اگلے باب سے معلوم ہو گی۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ یہ بصرہ ۱۷۸۴ء ہی میں آ چکا تھا، یعنی شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں عرب علاقوں سے اس کا تعلق پیدا ہو گیا تھا، جو مختلف حیثیتوں میں ایک عرصہ تک قائم رہا۔

لے صـ ۳۴؛ برانجس صاحب کے پیش رو اور ہمعصر برک ہارٹ (جس کی کتاب سے وہ تقریباً حرف بہ حرف نقل کرتا ہے) نے صرف اس قدر لکھا تھا۔

"اس نے مقبرے کے بڑے گنبد کو بھی گرانے (Destroy) کی کوشش کی" (ج ۲ صـ ۱۹۹) برانجس نے "غالباً" سے حاشیہ آرائی کی کوشش کی ہے۔ لیکن برک ہارٹ کی یہ اطلاع یقینی غلط ہے، آگے چل کر وہ خود لکھتا ہے کہ "مقبرے کو گزند نہیں پہنچا۔" (ج ۲ صـ ۱۲۰، ۱۴۵، ۲۰۹)

ایک واقف کار انگریز کی شہادت

غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں کا ایک انبار ہے۔ کہاں تک انہیں کھنگالا جائے۔ اب ہم اس گفتگو کو برانجس ہی کے ایک بیان پہ ختم کرتے ہیں، جس میں اس نے بعض غلط بیانیوں کی تردید کی ہے:

"باب عالی نے مشہور کیا کہ اُس نے (سعود بن عبدالعزیز) مدینہ منورہ کی زیارت سے لوگوں کو روک دیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں۔ اس نے صرف روضہ (مطہرہ) کے سامنے مشرکانہ اعمال کے ارتکاب سے منع کیا ہے، جیسا کہ دوسرے ولیوں کی قبروں پر بندش کر چکا ہے۔"

"بعض جاہل انہیں کافر سمجھتے ہیں۔ افواہوں پہ ترکوں نے اعتماد کیا، اشراف مکہ نے اسے ہوا دی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث پر پورے عامل ہیں۔ برک ہارٹ نے صحیح لکھا ہے "یہ سب غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا۔ اصل میں یہ اسلام کے اندر خالص تطہیر Puritanism کی تحریک تھی"۔"

"ایک بے وقوف فرنچ نے ۱۸۰۸ء میں لکھا کہ یہ کوئی نیا مذہب ایجاد کر رہے ہیں۔ نیز وہ سعود کے "خاص آدمی" کی زبانی حج کی منسوخی کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ وہابی قرآن کی طرح حدیث کو بھی اصولی چیز (Fundamental) مانتے ہیں۔ البتہ اولیاء اور

انبیاء کو یہ انسان مانتے ہیں۔ فتح مکہ کے بعد سعود نے جو اعلان کیا تھا وہ آج بالکل کتاب و سنّت کے مطابق تسلیم کیا جاتا ہے۔ تمباکو نوشی مالکیہ کے ہاں ممنوع ہے، انہوں نے بھی ممنوع کیا۔

"البتہ قہوہ کے امتناع کی خبر بالکل غلط ہے۔ اسے ترکوں نے پروپیگنڈے کے طور پر مشہور کیا۔ جس بے وقوف فرنگی[۱] نے حج کے تعطل کا ذکر کیا ہے، اُسے جاننا چاہیئے تھا کہ سعود نے صرف حج کے بُرے مراسم کو روکا تھا۔ مکہ میں داخلہ کے بعد اس نے جو پہلا کام کیا وہ طواف و عمرہ کی ادائیگی تھی[۲]۔۔۔۔۔۔"

ایک عجیب افترا

اسلیل بن رازق کی[۱] Imams and Sayeds of Oman میں ایک بدوی شیخ کی زبانی یہ افسانہ نقل کیا گیا ہے کہ "وہابیوں کے پاس قرآنِ مجید کا وہ حصّہ بھی ہے، جسے حضرت عثمان رضؓ نے اپنے مصحف سے حذف کر دیا تھا[۳]" الخ الخ

---

[۱] Rousseau نے ۱۸۰۸ء میں مندرجہ ذیل دو کتابیں لکھیں، جس میں اس نے وہابیوں پر حج کے روکنے کا بے بنیاد الزام رکھا ہے۔

(۱) Pashalik de Baghdad

(۲) A Memoirs in the Mines de'l orient

[۲] برانجس: صفحہ ۹۴-۱۰۶ ۔ برک ہارٹ ج ۲، صفحہ ۲۱۵-۲۰۰

[۳] صفحہ ۲۵۳-۲۵۱ ؛

خیریت یہ ہے کہ مترجم نے خود اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے[1] اور شاید اسی لئے کسی نے اُسے دہرایا نہیں۔ ہم نے یہاں صرف مخالفوں کی اوچھی حرکتوں اور احمقانہ افترا پردازیوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے اس کا ذکر کر دیا۔ جو لوگ دروغ بیانی اور افترا پردازی میں اس حد تک جا سکتے ہیں، ان سے کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

۱ؔ حاشیہ، ص-۳-۳۵۱۔

چھٹا باب

ماٰخذ اور لٹریچر

۱۔ تاریخی

۱۔ روضة الافکار والافہام لمرتاد حال الامام وغزوات ذوی الاسلام مصنفہ حسین بن غنام احسائی (ف ۱۲۲۵ھ)۔

یہ کتاب شیخ کی سیرت پر سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ مصنف شیخ کے شاگرد اور واقعات کے عینی شاہد ہیں۔ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں ذاتی حالات دعوت و تبلیغی رسالوں کا ذکر ہے۔ بعض طویل رسالے پورے پورے اس میں نقل کر دیئے گئے ہیں۔ دوسری جلد جنگوں اور مختلف واقعات کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ ترتیب سنہ وار ہے۔ ۱۱۶۰ھ سے شروع ہو کر ۱۲۱۲ھ پر کتاب ختم ہوتی ہے۔

مطبع مصطفویہ بمبئی میں چھپی تھی (۱۳۳۷ھ) لیکن اس وقت گویا ناپید ہے۔ بروکلمن کو بھی اس مطبوعہ نسخے کا پتہ نہیں تھا۔ اس کا ایک نہایت اچھا قلمی نسخہ

ندوۃ العلماء کے کتاب خانے میں ہے۔ ہمیں مطبوعہ نسخہ شرف الدین و اولادہ محمد علی روڈ بمبئی کی عنایت سے مستعار ملا، جس کے لیے ہم اُن کے شکر گزار ہیں۔

۲۔ عنوان المجد فی تاریخ نجد، مصنفہ عثمان[1] بن بشر نجدی (ف ۱۲۸۸ھ) مصنف نے شیخ کے فرزندوں اور سعود بن عبد العزیز (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء تا ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء) کا زمانہ پایا ہے۔ کتاب کا آغاز شیخ کی سیرت اور ۱۱۵۸ھ کے واقعات سے ہوتا ہے۔ پہلی جلد ۱۲۳۳ھ کے واقعات پر ختم ہوتی ہے، دوسری جلد ۱۲۶۷ھ کے واقعات پر ختم ہو جاتی ہے، مصنف نے شعبان ۱۲۷۰ھ میں کتاب کی تبییض سے فراغت حاصل کی۔

تفصیل اور واقعات کی تنقیح کے لحاظ سے، اسے ابن غنام کی کتاب پر ترجیح حاصل ہے، ——— پہلے بغداد میں ناقص چھپی تھی (۱۳۲۸ھ) ہمارے سامنے مطبعہ سلفیہ مکہ مکرمہ کا طبع شدہ مکمل نسخہ ہے (۱۳۴۹ھ)

واقعات کی تدوین میں ہم نے زیادہ تر اعتماد انہیں دونوں کتابوں پر کیا ہے۔ شیخ کی دعوت اور آلِ سعود کی تاریخ پر یہ دونوں کتابیں اصل اور "اُم" کا حکم رکھتی ہیں۔

۳۔ ان دو کتابوں کے علاوہ ایک تیسری کتاب مثیر الوجد فی معرفۃ انساب

---

[1] بروکلمن (ذیل ج ۲: ص ۵۲۱) نے ابنِ بشر (ف ۱۲۸۸ھ) اور عثمان بن قائد النجدی الحنبلی (ف ۱۰۹۷ھ؛ السحب الوابلہ ورق ۸۸ ب) صاحب نجاۃ الخلف باعتقاد السلف کے درمیان خلط کر دیا ہے۔

ملوک نجد کا ذکر بھی آتا ہے، جو شاید ملوک نجد کی تاریخ میں "اصل" اور ماخذ کا کام دے سکے۔ مارد تمان[1] اور خیر الدین زرکلی[2] نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ اُس کے مصنف رشید بن علی حنبلی غالباً ابنِ بشر کے معاصر ہوں گے۔ افسوس کہ ہمیں یہ کتاب دستیاب نہ ہو سکی۔

۴۔ عجائب الآثار فی التراجم والاخبار: مصنفہ عبدالرحمان بن حسن جبرتی مصری (۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء۔ ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۲ء) اس کی ترتیب بھی سنہ وار ہے۔ ۱۱۰۰ھ کے حوادث سے شروع ہو کر ۱۲۳۶ھ کے حوادث پر ختم ہوتی ہے۔ محمد علی پاشا کے حملوں اور مصر و حجاز کی آویزش پر اس کی شہادت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مصر اور اس کے متعلقات میں ہم نے جبرتی کے بیان کو ترجیح دی ہے۔ (مطبوعہ مصر: ۱۲۹۷ھ چار جلدوں میں)

۵۔ خلاصۃ الکلام فی امراء البلد الحرام: مصنفہ احمد بن زینی دحلان مکی شافعی (۱۲۳۲ھ۔ ۱۳۰۴ھ) اس کتاب میں اشرافِ مکہ کی مکمل تاریخ ہے۔ مکہ مکرمہ کے آخری دور کے حکام کی اتنی تفصیلی تاریخ مجھے اور کوئی نہیں ملی، اس لئے دحلان پر عدم اعتماد کے باوجود، اشرافِ مکہ سے متعلق اس کے بیانات کو اہمیت دینا پڑی۔ یہ کتاب ۱۳۰۰ھ میں تالیف ہوئی۔ علامہ سید رشید رضا مرحوم نے الھدیۃ السنیہ کے حاشیہ (ص۲) میں لکھا ہے کہ:

---

[1] مقالہ ابنِ سعود (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)۔

[2] الاعلام، ص ۳۶۸، ۵۵۸۔

"یہ دعوت کے ظہور کے زمانے میں مکہ مکرمہ میں مفتی تھے اور اپنے آقایان ولی نعمت کے چشم و ابرو کے اشارے پر اس جماعت کے متعلق غلط باتیں مشہور کیا کرتے تھے" ـــــ انہوں نے غلط بیانی اپنے یقین و اعتقاد کی بنا پر کی ہو یا کسی کے اشارے پر، اس سے بحث نہیں۔ البتہ یہ کہنا غلط ہے کہ "یہ دعوت کے ظہور کے زمانہ میں مفتی تھے۔ سنہ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں درعیہ برباد ہوا، اور دعوت کا "ظہور" "مرورِ ست" ختم ہو گیا تھا۔ مفتی احمد زینی دحلان کے شباب میں مکہ مکرمہ میں شاید کسی نجدی کا گزر بھی نہ ہوتا ہو۔

۶۔ فتاوی و افادات عبد الوہاب الخ (مخطوطہ فارسی) ـــ یہ ایک مختصر سا قلمی رسالہ ہے، جس میں امیر عبد العزیز بن سعود (سنہ ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء - سنہ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) کی طرف سے فتح علی شاہ قاچار (سنہ ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء - سنہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) کے نام ایک مکتوب اور بلاغِ عام ہے۔ اور آخر میں فتح علی شاہ کا جواب اور دھمکی ہے (مورخہ سنہ ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء: مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ: فہرست انگریزی مشرح ۱۳۳۷)

۷۔ البدر الطالع، محمد بن علی بن محمد بن عبد اللہ الشوکانی (سنہ ۱۱۷۳ھ/۱۷۶۰ء - سنہ ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) کی البدر الطالع میں گو آل سعود کے متعلق صرف مختصر "تراجم" ہیں[1]، پھر بھی ان کی ایک قیمت ہے، کہ محدث شوکانی نے بڑی عمر پائی اور شیخ سے لے کر آلِ سعود کا عروج و زوال دونوں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

---

[1] البدر الطالع ج ۱، ص ۲۶۳ - ج ۲ ص ۵

۸ - تاریخ نجد: مصنفہ محمود شکری آلوسی (۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء - ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء) نجد کی مختصر تاریخ ہے، جس میں شیخ کی دعوت اور آلِ سعود کی تاریخ کا بھی تذکرہ ہے۔ معلومات عام طور پر صحیح ہیں۔ ابنِ غنام اور ابنِ بشر ان کے مآخذ ہیں۔ شیخ اور ان کے شاگردوں کی تصنیفات بھی اُن کے پیشِ نظر تھیں ــــ مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۴۳ھ۔

۹ - الرحلۃ الحجازیۃ: مصنفہ محمد لبیب بتنونی - اس میں اشرافِ مکہ کی حکومت کا بیان مختصر اور مرتب ہے۔ غالباً ان کا زیادہ تر اعتماد دحلان کی خلاصۃ الکلام پر رہا ہے۔ محمد بن عبدالوہاب رح اور ان کی دعوت کا بھی ذکر ہے، لیکن صحتِ روایت کا التزام نہیں (صفحہ ۷۳-۹۴) ــــ مطبوعہ مصر ۱۳۲۹ھ (طبع دوم)

۱۰ - حاضر العالم الاسلامی (۴: ص ۱۶۲-۱۹۱) تاریخ نجد الحدیث، کے عنوان سے امیر شکیب ارسلان نے شیخ اور آلِ سعود کے متعلق ایک الگ فصل اپنی کتاب میں دی ہے۔ ان کا مآخذ زیادہ تر غیروں کی کتابیں ہیں، اس لئے غلطیوں سے خالی نہیں۔ پھر بھی غنیمت ہے۔ اور اس کے پڑھنے سے ایک اجمالی خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔

۱۱ - الزہراء (رجب ۱۳۴۵ھ: ۲: ۷) محب الدین خطیب کا شیخ کی زندگی پر ایک مختصر اور جامع مقالہ۔ خطیب نے[1] زیادہ تر ابنِ بشر اور ابنِ غنام سے اخذ کیا ہے، اس لئے بیانات مستند ہیں۔ ایک آدھ جگہ مثیر الوجد کا بھی حوالہ ہے۔ راقم نے کتاب

---

[1] دوسرا ایڈیشن، قاہرہ ۱۹۳۲ء

کے پہلے باب میں اس مضمون سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، مگر ان کے اصلی مآخذ بھی میرے سامنے تھے۔

۱۲ - اثر الدعوۃ الوہابیۃ فی جزیرۃ العرب : محمد حامد فقی کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں شیخ کی دعوت پر ہمدردانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ مصنف کے تعلقات سعودی حکومت اور علمائے نجد سے گہرے ہیں، اس لئے ان کی معلومات مستند اور ایک حد تک (OFFICIAL) الہی کہی جا سکتی ہیں۔ مگر افسوس کہ انھوں نے کہیں حوالہ نہیں دیا۔ عرب[1] معاصروں نے اور بھی کتابیں لکھی ہیں لیکن کسی نے تحقیق و تاریخ نگاری کا فرض ادا نہیں کیا۔ (مطبوعہ مصر، ۱۳۵۴ھ) طوالت کے خوف سے ہر ایک پر الگ الگ تبصرہ نہیں کیا جا سکا۔

۱۳ - جزیرۃ العرب فی القرآن العشرین : مصنفہ حافظ وہبہ۔ یہ ایک جامع کتاب ہے اور اس کے مصنف سعودی حکومت کے سفیر اور معتمد علیہ ہیں۔ کتاب اچھی اور پر معلومات ہے۔ دعوت (ص ۲۲۰-۲۴۲) آل سعود (ص ۲۲۳-۲۷۷) اور اخوان (ص ۳۱۱-۳۳۵) پر بھی تین الگ فصلیں ہیں۔ غلطیاں بہت کم اور زیادہ تر سنین کی تطبیق کی ہیں۔ محمد بن سعود

---

[1] معاصروں میں امین ریحانی مشہور شامی عیسائی ادیب کی کتابوں کا بڑا غلغلہ ہے۔ ان کے انگریزی اور عربی اڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں۔ ان کی ملوک العرب ہماری نظر سے گزری۔ معلوم ہوا کہ ایک اخبار نویس سے زیادہ ان کے معلومات کو وقعت نہیں دی جا سکتی۔ موجودہ طرز جدید کی انشا سے دلچسپی ہے۔ مگر مواد نہیں۔ تحقیق تو سرے سے مفقود ہے۔

کی وفات کی تاریخ ۱۷۶۵ء کی جگہ ۱۷۶۶ء دی ہے (ص ۲۴۴) اسی طرح شیخ کی وفات ۱۷۹۱ء میں درج کی ہے (ص ۳۳۸) حالانکہ صحیح ۱۷۹۲ء ہے اور بھی معمولی فروگذاشتیں ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے کتاب غنیمت ہے۔

۱۴- خالد بن محمد الفرج کا مقالہ مجلۃ الحج، مکۃ المکرمہ میں (ج ۵ ص ۴،۳،۲، ۵، ۶)

۱۵- اتحاف النبلاء (فارسی) (صفحہ ۴۱۳ - ۴۱۶) نواب صدیق حسن خان (ف ۱۳۰۷ھ) نے اس کتاب میں بھی شیخ کا حال لکھا ہے۔ اور ایک حد تک منصفانہ ہے (مطبع نظامی ۱۲۸۸ھ) (اس کے علاوہ التاج المکلل، مواہد العوائد وغیرہ میں بھی شیخ اور ان کی دعوت کا ذکر ہے)۔

۱۶- ترجمان وہابیہ (اردو) اس رسالہ میں نواب صدیق حسن خاں صاحب نے جماعت کے متعلق عجیب متضاد اور بے جوڑ باتیں کہی ہیں۔ غالباً وہ اپنے وقت کے مخصوص حالات سے گھبرا گئے تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ (مطبوعہ امرتسر: ۱۹۳۰ء)

۱۷- سلاطین نجد کا مذہب (معارف، نومبر ۱۹۲۴ء) اس مختصر مقالے میں استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی نے شیخ کی دعوت اور آل سعود کا مختصر اور دل نشین خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کا تمہیدی حصہ خاص طور پر دل آویز ہے[1] (جس کا ابتدائی ٹکڑا

---

[1] مولوی اسماعیل صاحب غزنوی نے الہدیۃ السنیہ کا اردو ترجمہ کیا ہے (جس کا ذکر آگے آتا ہے)۔ ترجمہ تو خیر جیسا بھی ہے۔ اس سے بحث نہیں، لیکن انہوں نے غضب یہ کیا کہ حضرت سید صاحب قبلہ کی پوری تمہید اپنے دیباچہ میں اس طرح نقل کر دی، گویا انہیں کی لکھی ہوئی ہے۔ اللہ ان کی اس لغزش کو معاف کرے۔

اس کتاب کا سرنامہ ہے)۔

۱۸۔ تاریخ نجد، مصنفہ حافظ اسلم صاحب جیراج پوری۔ شیخ کی سیرت، دعوت اور آلِ سعود کی تاریخ پر ایک مختصر اور سیدھی سادی کتاب ہے۔ زیادہ تر ابن غنام اور ابن بشر کی کتابیں ان کا ماخذ رہی ہیں۔ سادہ اور ہلکی پھلکی تاریخ کی حیثیت سے غنیمت ہے گو غلطیوں سے خالی نہیں۔

۱۹۔ سلطان ابن سعود: سلطان ابنِ سعود کی ـــــ سیرت سردار محمد صاحب حسنی بی۔اے نے لکھی ہے۔ اس میں ایک باب شیخ کی دعوت (صفحہ ۴۵ - ۲۹) پر بھی ہے۔ آلِ سعود اور آلِ رشید کی تاریخ بھی دی گئی ہے (صفحہ ۷۰ - ۴۵) ان کا سارا مدار انگریزی کتابوں پر معلوم ہوتا ہے۔ عربی اور اسلامیات سے شاید ادنیٰ لگاؤ بھی نہیں۔ ان کی واقفیت کا عالم یہ ہے کہ معتران کو مکرن اور مکران؛ مشاری کو مشعری؛ ثنیان کو ھوھینان لکھتے ہیں (ص ۳) اسی طرح عینیہ کو عیونیہ، الحسا کو اعصا (ص ۴۲) لکھا گیا ہے۔ تاریخی استناد کا عالم یہ ہے کہ محمد بن سعود کا سالِ وفات ۱۷۶۴ء (؟ ۱۷۶۵ء / ۱۱۷۹ھ) اور عبدالعزیز بن سعود کی شہادت کی تاریخ ۱۸۰۲ء (؟ ۱۸۰۳ء / ۱۲۱۸ھ) بتاتے ہیں۔ (صفحہ ۴۳ - ۴۴) سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ مصنف کے بیان کے مطابق امام احمد بن حنبل نے مؤطا امام احمد حنبل، مرتب کی تھی (صفحہ ۴۵) ـــــ کوئی بتلاؤ ہم بتلائیں کیا؟

جس شخص کے علم کا یہ عالم ہو، اُسے سلطان ابنِ سعود کی سیرت لکھنے کی کیا ضرورت آپڑی تھی؟ ہم نے یہاں تاریخی لٹریچر کے ضمن میں اس کتاب کا ذکر صرف عبرت کے

لئے گیا ہے ۔ وہابیوں کے متعلق ان صاحب نے جو غلط بیانیاں کی ہیں (ص ۲۶۲-۳)
ان کے ذکر کی شاید اب ضرورت بھی نہیں ۔

۲۰- نی بور[1] کا سفر نامہ **Travels through Arabia and other countries in the East.**

یہ سب سے پہلا یورپی سیاح ہے ، جس نے نجد اور شیخ الاسلام کی دعوت پر اپنے
سفر نامہ میں بحث کی ۔ گو اس کا بیان بہت مختصر ہے (جلد دوم ص ۱۳۶ - ۱۳۱) پھر
بھی اس لحاظ سے کہ یہ سب سے قدیم یورپی مآخذ ہے ، قابلِ قدر ہے ۔
نی بور اور اس کے رفقاء[2] ۱۷۶۱ء میں ڈنمارک سے روانہ ہوئے اور ۱۷۶۲ء
میں یمن پہنچے ۔ لیکن چند مہینوں کے اندر اس کے رفقائے سفر سب فوت ہو گئے ۔
صرف نی بور زندہ واپس ہوا (۱۷۶۵ء) اس کا سفر نامہ عرب اور خاص کر یمن کے
جغرافی ، معاشرتی اور اقتصادی حالات کے متعلق ایک اہم تاریخی اور جغرافی دستاویز
ہے ۔ اکثر مورخوں نے اس کے وقتِ نظر اور صحتِ بیان کی تعریف کی ہے[3] ۔

---

[1] امیر شکیب ارسلان نے پورا نام (Caresten Nie Buhr) لکھا ہے ۔
(ملحق تاریخ ابن خلدون ص ۱۷۲) ۔

[2] نی بور کے رفیقوں میں ایک جرمن عالم راتکن بھی تھا ۔ امیر شکیب نے اس کے پوتے سے
ملاقات کا ذکر کیا ہے (ایضاً)

[3] ہوگارتھ : ص ۶۷-۱۷ = بلاد عرب کے یورپی سیاحوں پر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب (لاہور) کا (باقی حاشیہ ورق ۱۱)

نی بور خود نجد نہیں جا سکا تھا، اس لئے سنی سنائی باتوں پر اعتماد کی وجہ سے اس کا بیان فاش غلطیوں سے پاک نہیں رہ سکا ہے۔ اس کے بیان کی قیمت اس لئے بھی ہے کہ یہ شیخ کی زندگی میں بلادِ عرب پہنچا اور ایسے وقت کہ ابھی دعوت غیب پھیل بھی نہ سکی تھی۔ ریاض کی فتح ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں ہوئی اور اس سے پہلے شیخ کا حلقۂ اثر محدود تھا۔ ہمارے پیش نظر نی بور کے سفر نامہ کا انگریزی ترجمہ ہے جو مترجم کا نام Robert Heron ہے (مطبوعہ ایڈنبرا ۱۷۹۲ء)۔

(۲۱) بادیا (Badia) جو علی بیگ عباسی کے نام سے ۱۸۰۷ء میں جدہ اترا۔ اور مکہ کی زیارت کی۔ مدینہ منورہ جانے سے اسے نجدی حکام نے روک دیا تھا۔ یہ پہلا یورپی سیاح ہے۔ جس نے وہابی نجد اور اس کے پایۂ تخت درعیہ کے متعلق کچھ معلومات بہم پہنچائیں۔ اس کے سفر نامے کا تاریخی حصّہ اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس نے حجاز میں مصریوں کی مداخلت سے پہلے وہابیوں کی حکومت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ ایک عینی شاہد کی معاصرانہ شہادت کا درجہ رکھتا ہے۔ افسوس کہ اس کا سفر نامہ ہمیں دستیاب نہ ہو سکا۔ ہم نے جہاں کہیں بھی اس کی

(بقیہ حاشیہ برص ۱۹۶) کا بھی ایک مختصر لیکن فاضلانہ مقالہ اورینٹل کالج میگزین لاہور میں نکلا تھا۔ (اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۷ء؛ اگست ۱۹۳۷ء؛ دیارِ عرب کے مغربی سیاح) اور حقیقت میں سب سے پہلے اسی مقالے نے مغربی سیاحوں کے سفر ناموں کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔ اس کے بعد پروفیسر ہوگارتھ کی کتاب سے مزید روشنی ملی، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ فلبی ص ۲۱ نے بھی نی بور کی اولیت اور اہمیت کا ذکر کیا ہے۔

شہادت نقل کی ہے، ہوگارتھ کے واسطہ سے ۔

۲۲ ۔ برک ہارٹ کی کتاب Notes on the Bedouins and the Wahhabya جلد ۲ ص ۳۴۹-۹۵ ۔

یہ مغربی سیاح ۱۸۱۴ء میں حجاز پہنچا، جب محمد علی پاشا نجدیوں کو حجاز سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اور ۱۸۱۶ء میں مصر واپس ہوا، جہاں وہ تھوڑے عرصے کے بعد فوت ہو گیا۔ اس نے درعیہ اور بلادِ عارض کا مفصل اور محققانہ جغرافیہ دیا ہے۔ اس نے اپنے سفرنامے کی پہلی جلدوں Travels in Arabia میں مکہ معظمہ اور حج وغیرہ کی جو تفصیل کی ہے، وہ اپنی جگہ پر نہایت مستند ہے۔ مکہ مکرمہ کے نظامِ حکومت پر بھی اس کی بحث عالمانہ ہے[1]۔ رچرڈ برٹن جس[3] نے ۱۸۵۰ء کے بعد مکہ و مدینہ کا سفر کیا، برک ہارٹ کا ثناخواں ہے اور انتہائی ادعائے تحقیق کے باوجود برک ہارٹ[2] کے بیانات پر کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہ کر سکا[4]۔

اس کے سفرنامے کی پہلی دو جلدیں ۱۸۲۹ء میں چھپیں اور آخری دو جلدیں

---

[1] Penetration of Arabia. ص ۸۲-۸۷

[2] Travels etc. : ص ۲۴۴ - ۲۰۵

[3] کیپٹن سر رچرڈ برٹن (R F Burton) جس نے برک ہارٹ کے تقریباً چالیس برس بعد حجاز کا سفر کیا۔ لیکن اہلِ نجد کے متعلق کوئی اہم بات نہیں لکھی۔ اس کے سفرنامہ کا ایک خاص ایڈیشن دو جلدوں میں بڑے آب و تاب سے چھپا ہے (لندن: ۱۸۹۳ء)

[4] ہوگارتھ ص ۹۰-۸۹ ۔

(Notes. ج ۲) ۱۸۳۱ء میں شائع ہوئیں۔ یہ چاروں جلدیں عرب اور اس کے جغرافیہ و متعلقات پر معلومات کا گنجینہ ہیں۔ ہمیں اس کتاب میں صرف Notes (on etc. کی دوسری جلد سے بحث تھی۔ محمد علی مصری کے حملہ حجاز اور مصر و نجد کی لڑائیوں پر اس کے بیانات صد درجہ مستند اور عینی شہادت کا درجہ رکھتے ہیں۔

۲۳۔ برائجس (Harford joins Brydges) کی کتاب

A Brief History of the Wahhabys

یہ شخص ایک برطانوی افسر کی حیثیت سے ۱۷۸۴ء میں بصرہ پہنچا اور ۱۷۹۴ء تک وہیں رہا۔ درمیان میں کچھ وقفے کے بعد پھر بغداد میں اس کی تعیناتی ہوئی، جہاں ۱۷۹۸ء سے ۱۸۰۶ء تک اس کا قیام رہا۔ دونوں جگہوں میں یہ پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے تھا اور سعود بن عبدالعزیز کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے تھے۔ گویا یہ شیخ الاسلام کی زندگی ہی میں بلادِ عرب آگیا تھا اور سعود بن عبدالعزیز کے اہم فتوحات کے زمانہ میں وہاں موجود تھا۔ اس لحاظ سے اس کی کتاب کی اہمیت اور تاریخی قیمت ہونا چاہیئے، مگر افسوس کہ اس میں وقتِ نظر نہیں۔ جا بجا برک ہارٹ کی حرف بہ حرف نقالی کرتا ہے، جو اس کے بعد حجاز آیا اور پہلے مرا۔

یہ کتاب ۱۸۳۴ء میں لندن سے شائع ہوئی اور برک ہارٹ کی کتابیں ۱۸۲۹ء اور ۱۸۳۱ء میں نکل چکی تھیں۔ خود بھی اسے برک ہارٹ کی خوشہ چینی کا اعتراف ہے۔ کہیں کہیں اس نے اضافہ بھی کیا ہے[1] لیکن اہم واقعات حرف بہ حرف

---

[1] برک ہارٹ کا مرقع ۱۸۱۶ء کے وسط پر ختم ہو جاتا ہے۔ برائجس نے ایک اہم اضافہ

(باقی حاشیہ بر صفحہ)

برک ہارٹ ہی سے لئے ہیں -

۲۴ - پالگریو (W. Gifford Palgrave) کا سفر نامہ

(Narrative of a year's journey through Central and Eastern Arabia)

یہ ایک کیتھولک عیسائی اور شہری زندگی کا عادی اور طبعاً ایک آرام پسند شخص تھا - ۱۸۶۲-۳ء میں اس نے عرب کی سیاحت کی - اُس نے حضری عربوں (حسا، قطیف وغیرہ کے باشندے) کی خوب تعریفیں کی ہیں - لیکن اہلِ بادیہ کی ہمدردی کے لئے اس کے پاس ایک لفظ نہیں - اس نے اہلِ نجد، شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے ماننے والوں کی بڑی برائیاں کی ہیں - زویمر (حاشیہ ۱۹۸) اور ہیوجس (صفحہ ۵۰ ب) کی رائے ہیں وہابیت کی برائی میں اس کی "کیتھولکیت" کو بھی دخل تھا - زویمر کی رائے میں زیادہ سے زیادہ ۱۸۶۲-۳ء کے واقعات میں اس کے بیان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، لیکن ہمارے خیال میں کسی مسئلہ کے متعلق صرف اس کے بیان پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا - شیخ پر اس نے جو کچھ لکھا ہے - خرافات کا مجموعہ ہے

یہ کیا ہے کہ اس نے محاصرہ درعیہ (۱۸۱۸ء) کی پوری تفصیل فرانسیسی مؤرخ M. Mengin (History de l'Egypt Sons le Government de Mohammad Aly) (مصر کی تاریخ محمد علی کے عہد حکومت میں) سے حرف بہ حرف نقل کر دی ہے (صفحہ ۱۶۱-۱۳۵)

(صفحہ ۳۸- ۳۶۳) آل سعود کی تاریخ بھی (صفحہ ۸۷-۳۸) اسمار اور تاریخوں کی فاش غلطیوں سے پُر ہے۔ ہیوجس نے خوب لکھا ہے کہ "اس کے بیانات دلچسپ لیکن ناقابلِ اعتماد ہیں" ۔زویمر کہتا ہے :-

"ایک کیتھولک سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ تجدید اور سلفیت کی دعوت کا ذکر اچھے انداز میں کرے گا"۔ نفسِ اسلام کے متعلق اس نے جو ہرزہ سرائیاں کی ہیں، وہ انتہائی رکیک اور یکسر ناقابلِ اعتنا ہیں —— حد تو یہ ہے کہ وہ اپنے معاصروں کی نشاندہی بھی صحیح نہیں کر سکا۔ شیخ عبدالرحمان بن حسن بن عبدالوہاب کو عبدالرحمان بن عبدالوہاب، اور ان کے بیٹے عبداللطیف، بن عبدالرحمان بن حسن کو عبدالرحمان بن عبداللہ کا بیٹا بتاتا ہے (صـ ۳۷۹) اور مزید یہ کہ "عبداللہ بن عبدالوہاب (؟) درعیہ میں ابراہیم پاشا کے حکم سے قتل کر دیئے گئے تھے" طرہ یہ ہے کہ وہ ریاض میں شیخ عبدالرحمن سے ملا بھی تھا۔ اس کا سفرنامہ دو جلدوں میں چھپا ہے (۱۸۶۵ء)

۲۵- لیوس پلی کی (A Political Mission to Nejd)۔

یہ شخص بوشہر میں برطانی ریزیڈنٹ تھا۔ ۱۸۶۵ء میں فیصل بن ترکی (ف ۱۸۶۵ء/۱۲۸۲ھ) سے خلیج فارس کے ساحلی مقامات کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے ریاض آیا۔ ہمیں اس کی کتاب نہ مل سکی، ممکن ہے اس میں کچھ مواد ہو، ہیوجس نے اپنے مآخذ میں اس کی

ل Notes etc.,, صـ ۲۲۱

ل حاشیہ: صـ ۹۸

کتاب کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہوگارتھ[1] نے بیوس پلی کے مشن پر کافی بحث کی ہے اور اس کے سفر کی جغرافی قیمت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن اس کی تاریخی تحقیقات کا بالکل ذکر نہیں کیا۔

۲۶- بیجر (G. Percy Bedger) کی (Imams and Syeds of Oman) یہ کتاب اصل میں ایک عربی مخطوطہ (مصنفہ سلیل بن رزیق) کا ترجمہ ہے، جس میں عمان کے امرا کی پوری تاریخ مفصل بیان کی گئی ہے (آغاز اسلام سے ۱۸۵۶ء تک) بیجر نے انگریزی ترجمے میں حواشی اور ایک مبسوط مقدمہ کا اضافہ کیا ہے، جس میں کتاب کے پورے مواد پر بحث ہے اور عمان کی تاریخ بھی ۱۸۷۰ء تک مکمل کر دی گئی ہے۔

چوں کہ آلِ سعود کی دعوت اور سیاسی عروج دونوں کا خلیج فارس اور جزیرہ نمائے عرب کے تمام ساحلی علاقوں سے گہرا تعلق رہا ہے، اس لئے ان کی تاریخ بھی جا بجا زیرِ بحث آئی ہے۔ بیجر کے حاشیے عام طور پر پُر معلومات اور اچھے ہیں، البتہ نجد کے متعلق وہ پالگریو پر زیادہ اعتماد کرتا ہے۔ آلِ سعود کے متعلق چونکہ زیادہ تر معلومات سیاسی نزاعوں اور حملوں کی تفصیل سے متعلق ہیں، اس لئے زیرِ نظر تالیف میں زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ (مطبوعہ لندن ۱۸۷۱ء)

۲۷- ڈاؤٹی (Daughty) پالگریو کے تیرہ برس بعد ۱۸۷۵ء میں نجد

---

[1] صفحہ ۳۱۰ - ۳۰۸

آیا۔ بدوؤں کی معاشرت کی تفصیل، جغرافی اور لسانی تحقیقات کے لحاظ سے اس کے سفرنامے کی جو علمی قیمت ہو، اہلِ نجد کی تاریخ پر اس نے کوئی خاص مسالہ نہیں چھوڑا۔ سوائے اس پیش گوئی کے:

"وہابی حکومت موت کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اور اب وہ دوبارہ اس میں جان نہیں آسکتی .... عام طور پر نجد میں یہی خیال ہے[1]۔"

واقعات و مشاہدات نے اس خام خیالی کی تکذیب کر دی۔ اس کا سفرنامہ Travels in Arabia Deserta دو جلدوں میں ہے (۱۸۸۸ء اور ۱۹۲۱ء)

۲۸ - لیڈی این بلنٹ (Anne Blunt) کا سفرنامہ

A Pilgrimage to Nejd: مشہور سیاسی مدبر اور شاعر ولفرڈ سکاون بلنٹ Wilfrid Scawn Blunt اور ان کی بیگم لیڈی بلنٹ (جو مشہور شاعر بائرن کی پوتی تھیں) نے غالباً اچھے گھوڑوں کی تلاش میں عرب اور نجد کی سیاحت کی تھی (۱۸۷۹ء) لیڈی بلنٹ کے سفرنامے سے ہمارے موضوع کا تعلق نہیں۔ 'دیباچہ' اور 'ضمیمہ' جو خود ولفرڈ بلنٹ نے لکھا ہے، ان میں نجد کے جغرافیہ (دیباچہ xxiii - i) اور "وہابیت کے عروج و زوال" کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ (جلد ۲ صـ ۲۶۱ - ۲۵۱) گو غلطیاں کافی ہیں، پھر بھی

---

[1] ج ۲ صـ ۴۲۵

ایک "خاکہ" کی حد تک غنیمت ہے۔ کتاب میں جہاں کہیں بلنٹ کا حوالہ آیا ہے، یہی ضمیمہ مراد ہے۔ اصل سفرنامہ دو جلدوں میں چھپا ہے (لندن ۱۸۸۱ء)

ولفرڈ بلنٹ کی 'فیوچر آف اسلام' (صفحہ ۴۶-۴۲، ۱۰۶۰) میں بھی شیخ کی دعوت کا ذکر آیا ہے۔ اس مختصر سے بیان میں بھی متعدد غلطیوں اور غلط فہمیوں کے نمونے ملتے ہیں، جن کی طرف غلط بیانیوں کے ضمن میں اشارہ نہیں کیا جاسکا۔ اس کا اگر کہیں حوالہ آیا ہے، تو کتاب کی تصریح کے ساتھ ۱۸۸۲ء کا چھپا ہوا نسخہ ہمارے سامنے رہا ہے۔

۲۹- ہیوجس (Thomas P. Hughes)[1] کی ڈکشنری آف اسلام (Dictionary of Islam)

اس پروٹسٹنٹ مشنری کا یہ مقالہ بہتیرے مسلمان عالموں کی تحریروں سے بہتر ہے۔ جہاں تک دعوت کے منشا کا تعلق ہے، اس نے سمجھنے میں غلطی نہیں کی اور اس نے شیخ کی تعلیمات کا بہت اچھا خلاصہ دیا ہے۔ تاریخی فروگذاشتیں ہیں، اور وہ صدقہ ہیں برجس اور بلنٹ کا —— اس کتاب میں جہاں کہیں ہیوجس (Hughes) کا حوالہ ہے، یہی مقالہ مراد ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۸۵ء)

۳۰- اسی ہیوجس کا دوسرا مقالہ (The Wahhabi) اس کی مختصر کتاب (Notes on Mohammadanism) میں (صفحہ ۲۲۶-۲۱۹)۔ —— اس میں عام عقائد وغیرہ کے علاوہ سلاطین آلِ سعود کی بھی ایک مکمل فہرست

---

[1] مقالہ وہابی (ص ۶۶۲-۶۵۹)۔

دی گئی ہے۔ (۱۸۶۵ء تک) اس مختصر مقالے میں ڈکشنری آف اسلام والے مقالے (Wahhabia) پر کچھ مفید اضافے بھی ہیں، خاص کر ہندوستانی مجاہدین کے متعلق جن پر گفتگو کا یہاں موقع نہیں۔ اس مقالے کا جہاں حوالہ آیا ہے نوٹس کی تصریح کے ساتھ ——— (مطبوعہ: لندن ۱۸۷۷ء)۔

(۳۱) زویمر (Zwemer) کی Arabia, the Cradle of Islam

زویمر نے اپنے تعصب کے باوجود شیخ کی دعوت کے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس تحریک سے قبل عرب کی حالت کا بھی صحیح جائزہ لیا ہے (ص ۳-۱۹۲) اپنی کتاب کے اس باب میں اُس نے صرف تین تاریخی غلطیاں کی ہیں۔

(۱۔ سنہ ولادت: ۱۶۹۱ء، ۲۔ سفر بغداد، ۳۔ ہدم قبہ رسول) لیکن استنتاج میں اس کا تعصب غالب رہا۔ ارشاد ہوتا ہے:

"یہ تحریک، اسلام کی تجدید تھی، گو بالکل ناکامی (Disaster) پر ختم ہوئی۔ اور سیاسی طور پر ایک شاندار ڈھونگ ثابت ہوئی" ص ۲-۱۹۱ (دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۲ء)

۳۲۔ ہوگارتھ (David George Hograth)

(The Penetration of Arabia)

ہوگارتھ نے اس کتاب میں ان تمام یورپی سیاحوں کی کوشش کا مفصل اور گہرا جائزہ لیا ہے، جنہوں نے گزشتہ تین صدیوں میں بلادِ عرب کی سیاحت کی اور وہاں کے جغرافیہ، تاریخ، اثریات، معاشرت، آداب و رسوم وغیرہ کے متعلق کوئی تحریری دستاویز یادگار چھوڑی۔ اس سلسلے میں ان سیاحوں کے کارناموں

پر بھی پورا پورا تبصرہ ہوا ہے ، جنہوں نے شیخ اور ان کے جانشینوں کے ایام حکومت میں بلادِ نجد و حجاز کی سیاحت کی ۔ ہم نے ہوگارتھ کے مختلف بیانوں کا اصل سفرناموں سے بارہا مقابلہ کیا، لیکن اس کے نقل اور تبصرے میں کہیں ادنیٰ فروگذاشت نہیں پائی - اس لئے اصل سفرناموں کی عدم موجودگی میں اس کے خلاصے اور تبصرے سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ۔ (مطبوعہ : لندن ١٩٠٤ء)

اس کتاب میں جہاں کہیں ہوگارتھ کا حوالہ ہے، یہی کتاب مراد ہے۔

ہوگارتھ کی ایک دوسری مختصر کتاب (A History of Arabia) میں بھی اشرافِ مکہ (ص ٨٢ – ٩٣) اور وہابی اور مصری (ص ٩٩ – ١١٣) پر دو باب ہیں ، مگر حیرت ہوتی ہے کہ یہاں وہ محمد بن سعود و عبد العزیز بن محمد بن سعود اور سعود بن عبد العزیز کے درمیان ٹھیک ٹھیک فرق نہ کر سکا (ص ١٠٣) ۔

٣٢ - فلبی (H. St. J. B. Philby) کی کتاب (Arabia)

مطبوعہ لندن ١٩٣٠ء (The Modern World Series)

فلبی نے اس کتاب میں شیخ کی دعوت سے لے کر سلطان عبد العزیز بن عبد الرحمان بن فیصل بن ترکی بن عبد اللہ بن محمد بن سعود تک، نجد کی پوری تاریخ لکھی ہے ۔ شیخ کی سیرت اور دعوت کا حصہ یکسر ابن غنام اور ابن بشیر سے ماخوذ ہے[1]۔ کتاب ہر لحاظ سے مفید اور قیمتی معلومات کی حامل ہے - اور ہم نے اس سے کافی فائدہ اٹھایا

---

[1] فلبی نے خود بھی دیباچہ (ص ۷) میں لکھا ہے کہ "یہ پہلی کتاب ہے جو اصل ماخذ کی بنیاد پر انگریزی میں مرتب ہوئی ہے" - اور اس کا لکھنا صحیح ہے - شیخ کے متعلق غالباً کسی مغربی زبان میں اتنی صحیح معلومات یکجا نہیں مل سکتیں ۔

ہے، لیکن اصل ماخذ کو سامنے رکھ کر ۔۔۔ اس کتاب کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ بلادِ عرب میں حکومتِ برطانیہ کو ایک "عصائے پیری" کی ضرورت ہے، اور اس کے لئے فرماں روائے نجد زیادہ موزوں ہیں۔ شریف حسین کی امداد اور ابن سعود سے بے اعتنائی پر اس نے وُھائٹ ہال، حکومتِ ہند اور حکومتِ بصرہ و بغداد پر سخت سے سخت تنقیدیں کی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جزیرۃ العرب میں برطانی ڈپلومیسی پر یہ کتاب کافی روشنی ڈالتی ہے، لیکن اس وقت ہمیں اس رخ سے سردست کوئی تعلق نہیں۔

۳۴۔ ماردتمان (Mordtmann) کے مقالے (ابن سعود اور ابن الرشید (مندرجہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)۔

جرمن مستشرق، ماردتمان کے یہ مقالے اختصار کے باوجود جامع اور بڑی حد تک صحیح ہیں سنین اور تاریخوں کی تعیین کی کوشش قابلِ تحسین ہے۔ اس سے پہلے تاریخوں کی ٹھیک ٹھیک تعیین اور ہجری اور عیسوی سنین کی تطبیق کا کسی نے التزام نہیں کیا۔ ہمیں کہیں کہیں اس سے اختلاف کرنا پڑا ہے، لیکن ابن سعود والے مقالے سے مدد بھی بہت ملی۔

۳۵۔ مارگولیوتھ (D. S. Margoliouth) کے دو مقالے:

(۱) وہابیہ: (Wahhabiyah) (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)

(۲) وہابی (Wahhabies) (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز اینڈ اتھکس)

دونوں مقالے غلطیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ غلطیاں تو ہر کسی سے ہوتی ہیں، لیکن ان صاحب کی ادا نرالی ہے۔ جہل مرکب اور غلطیوں کا انبار اتنا اور کہیں نہیں ملے گا ۔۔۔ اس کتاب میں جہاں صرف مارگولیوتھ کا حوالہ دیا ہے، پہلے مقالے کی طرف اشارہ ہے۔

(۳۶) راونشا (T. E. Ravenshaw) کی یادداشت **Memorandum**

——گو اس یادداشت کا تعلق مولانا احمد اللہ صادق پوری (ف ۱۲۹۸ھ) کے مقدمے اور ہندستانی مجاہدین کی تحریک تجدید و جہاد سے ہے، بایں ہمہ اس میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی دعوت کے متعلق بھی خوب غلط بیانیاں کی گئی ہیں جس کا ایک نمونہ گزر چکا ہے (ملاحظہ ہو: اس کتاب کا پانچواں باب) —— یہ یادداشت پوری کی پوری کلکتہ گزٹ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء کے ضمیمے کی حیثیت سے چھپی ہے۔

(۳۷) ولیم ولسن ہنٹر **W W Hunter** کی (**The Indian Musalmans**) مسلمانانِ ہند (مطبوعہ: ۱۸۷۱ء)[1]

اس کتاب کا تعلق بھی ہندوستانی مجاہدوں کی سرگرمیوں سے ہے۔ چونکہ یہ حضرات ہندستان کی تحریک تجدید و جہاد کو شیخ الاسلام ہی کی دعوت کا شاخسانہ بتاتے ہیں۔ اس لئے خواہ مخواہ انہیں شیخ کی دعوت پر بھی گفتگو کرنا پڑتی ہے[2] اس سلسلے میں ہنٹر صاحب نے بھی اپنی ناواقفیت کا خوب خوب ثبوت دیا ہے[3] کچھ نمونے اوپر گزر چکے ہیں۔ ان "غلط بیانیوں" میں اس کا ماخذ زیادہ تر راونشا کی 'یادداشت' رہی ہے۔ گو یہ حوالہ نہیں دیتا۔

---

[1] اب یہ کتاب دوبارہ چھپ گئی ہے۔ نظر ثانی کے وقت یہی نسخہ ہمارے سامنے ہے (کلکتہ: ۱۹۴۵ء)

[2] اس سلسلے میں ہم نے جتنی کتابوں اور مقالوں کا ذکر کیا ہے، اُن سب میں نجد اور ہندوستان کی تحریکوں کو ایک بتایا گیا ہے۔ بعض صرف "اصول" کی حد تک ایک بتاتے ہیں، اور اکثر حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد و تجدید کو شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی دعوت کی شاخ بتلاتے ہیں جو یکسر غلط ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: راقم کی ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک)

[3] خاص طور پر ملاحظہ ہو: ص۱۱ اور اس سے آگے۔ (نیا اڈیشن)۔

۳۸- (Andre Servier) کی (Islam and Psychology of the Musalmans) (اصل فرنچ کا ترجمہ: لندن ۱۹۲۴ء)

ان صاحب نے محمد بن عبد الوہاب اور ان کی جماعت کو جی بھر کر گالیاں دی ہیں اور یوں تو نفسِ اسلام ہی ان کے نزدیک "انسانیت کی ہر ترقی کا دشمن" ہے۔ (صفحہ ۲۶۴) — پالگریو ان کا ماخذ معلوم ہوتا ہے۔

۳۹. (Wilson Cash) کی (The Expansion of Islam) (مطبوعہ لندن ۱۹۲۸ء)

ان صاحب کا خیال ہے کہ محمد بن عبد الوہاب "عربی اسلام" چاہتے تھے (ص ۱۵۹) اس قسم کی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی کمی نہیں۔ ان مولف کتابوں میں بھی شیخ کی دعوت کا ذکر ضمنی طور پر آیا ہے۔

۴۰۔ رچرڈ کوک (Richard Coke) کی (The Arab's Place in the Sun) (ص ۱۷۰-۱۶۱)

دعوت پر ایک اچھا مختصر تبصرہ ہے۔ غلطیاں بعض عام قسم کی ہیں، اور بعض ناموں کے الٹ پھیر سے ہوئی ہیں۔ سعود بن عبد العزیز کے کارناموں کو یہ عبد العزیز کی طرف منسوب کرتا ہے (ص ۱۶۳) اور عبد اللہ بن سعود اور سعود بن عبد العزیز کے درمیان بھی ٹھیک ٹھیک فرق نہیں کر پاتا۔ (ص ۱۶۳)

نمبر ۳۴ سے نمبر ۴۰ تک جن کتابوں کا ذکر کیا گیا، ان کی حیثیت ماخذ کی نہیں بلکہ عام لٹریچر کی ہے۔ یہ فہرست اور طویل ہو سکتی تھی، لیکن اختصار کے خیال سے اتنے ہی پر

اکتفا کرنا پڑا بعض کتابوں کے ضمنی حوالے اصل کتاب میں آ گئے ہیں، جیسے اسٹاڈرڈ Lothrop Stoddard کی جدید دنیائے اسلام (The New World of Islam) وغیرہ

۲۔ مذہبی (الف)

توحید اور انکارِ بدعات پر سینکڑوں، ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان کا استقصا مشکل ہے بخاص طور پر امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) اور اُن کے شاگردِ رشید امام ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کی کتابیں ان مباحث سے بھری پڑی ہیں۔ ہم یہاں صرف ان کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے مطالعہ کا اس دوران میں ہمیں موقع ملا اور شیخ کی دعوت کے سمجھنے میں اُن سے مدد ملی۔

۱۔ الباعث علی انکار البدع والحوادث لابی محمد عبدالرحمان بن اسماعیل بن ابراہیم ابی شامۃ المغربی (ف ۶۶۵ھ) —— (مطبوعہ مصر: ۱۳۱۰ھ)

۲۔ تجرید التوحید المفید للشیخ تقی الدین احمد بن علی المقریزی (ف ۸۴۵ھ) (مصر ۱۳۴۳ھ)

۳۔ تطہیر الاعتقاد عن ادران الالحاد لمحمد بن اسماعیل الامیر الیمنی الصنعانی (ف ۱۱۸۲ھ) (مصر ۱۳۴۸ھ)

۴۔ کتاب التوحید لمحمد بن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۶ھ)

(مطبوعہ: ۱۳۴۴ھ مع تعلیقات استاذ محترم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی)

اور شیخ کی دوسری تصنیفیں اور رسالے۔

۵۔ الدر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید لمحمد بن علی الشوکانی (ف ۱۲۵۰ھ)

اس کا اردو ترجمہ بھی مولوی محمد علی صاحب قصوری ایم اے کے قلم سے چھپ گیا ہے (۱۹۲۴ء)

۶ - التُحف فی مذاہب السلف الشوکانی طبع مصر ۱۳۱۰ھ

۷ - مجموعۃ الهدیۃ السنیۃ والتحفۃ الوہابیۃ النجدیۃ : مرتبہ سلیمان بن سحمان نجدی ـــــ

اس مجموعہ کے مرتب نجد کے مشہور علماء میں شمار کئے جاتے تھے۔ شیخ عبدالرحمان بن حسن آل الشیخ (ف ۱۲۸۵ھ) اور شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمان بن حسن دونوں سے استفادہ کیا۔ چھیاسی سال کی عمر میں وفات پائی (۱۳۴۹ھ)۔

اس مجموعے میں حسب ذیل رسالے ہیں :۔

الف ۔ الرسالۃ الدینیۃ فی معنی الالٰہیۃ (ص ۳-۲۸) للامیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود (ف ۱۲۱۸ھ)

ب ۔ شیءٌ من سیرۃ الشیخ وتعالیمہ (ص ۲۸-۴۰) للشیخ عبداللطیف بن عبدالرحمان آل الشیخ (ف ۱۲۹۳ھ)

ج ۔ الرسالۃ الثالثۃ (ص ۴۱-۵۵) للشیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب۔ (ف ۱۲۴۲ھ)

یہ رسالہ ۱۲۱۸ھ میں اہل مکہ مکرمہ کی تعلیم کے لئے لکھا گیا، جب سعود بن عبدالعزیز پہلی مرتبہ حرم میں فاتحانہ داخل ہوا۔

د ۔ الفواکہ العذاب فی الرد علی من لم یحکم السنۃ والکتاب (ص ۵۵-۹۰) للشیخ احمد بن ناصر بن عثمان المعمری النجدی (ف ۱۲۲۵ھ)

یہ رسالہ ۱۲۱۱ھ میں تالیف ہوا، جب شیخ احمد بن ناصر امیر عبدالعزیز کی طرف

۱؎ اس کا انگریزی ترجمہ اوکنلی (J. O'Kinely) کے قلم سے جرنل ایشیاٹک سوسائٹی (۱۸۷۴ء، حصہ ۶۸-۸۲ (۱))۔ ترجمہ میں بعض مضحکہ انگیز غلطیاں بھی ہیں۔ جیسے الامہات الستۃ (حدیث کی چھ مستند کتابیں: صحاح ستہ) کا ترجمہ اس نے (Six Mothers) کیا ہے۔ (ص ۴۷) وغیرہ وغیرہ۔

سے حجاز بھیجے گئے اور رجب سنہ ۱۲۱۱ھ میں علمائے حرم سے مناظرہ ہوا۔

۵ - الرسالة الممتعة (ص ۹۱-۹۹) : للشيخ محمد بن عبد اللطيف بن عبد الرحمان آل الشيخ (ف سنہ ۱۳۶۷ھ)

یہ رسالہ سنہ ۱۳۳۹ھ میں تالیف ہوا۔

ان رسالوں کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے (از مولوی اسماعیل صاحب غزنوی) (سنہ ۱۹۲۷ء)
آخر میں کچھ قصیدے ہیں (ص ۱۰۱-۱۱۱)

۸ - فتح المجيد شرح كتاب التوحيد : تاليف الشيخ عبد الرحمان بن حسن آل الشيخ (ف سنہ ۱۲۸۵ھ) (طبع سوم : قاہرہ سنہ ۱۳۵۷ھ)

۹ - جلاء العينين في محاكمة الأحمدين : للشيخ نعمان خير الدين الآلوسي البغدادي (ف سنہ ۱۳۱۷ھ) (بولاق : سنہ ۱۲۹۸ھ)

یہ کتاب بہت مفید اور جامع معلوم ہوئی اور اس لئے میں نے اسے بار بار پڑھا۔ سید رشید رضا مرحوم (ف سنہ ۱۳۵۳ھ) نے بھی اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اس کی بہت تعریف کی ہے (ملاحظہ ہو معارف نومبر - دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء)

۱۰ - الانتقاد الرجيح في شرح الاعتقاد الصحيح للنواب صديق حسن خان (ف سنہ ۱۳۰۷ھ) (بولاق : سنہ ۱۲۹۸ھ على هامش جلاء العينين -)

۱۱ - تنبيه ذوي الألباب السليمة عن الوقوع في الألفاظ المبتدعة الوخيمة : لسليمان بن سحمان النجدي (ص ۱-۸۱)

۱۲ - تبرئة الشيخين الإمامين من تزوير أهل الكذب المين : لسليمان بن سحمان (ص ۸۲-۲۱۵)

یہ دونوں رسالے ایک ساتھ چھپے ہیں۔ (مصر : سنہ ۱۳۴۳ھ)

(ب)

۱۳۔ کتاب التوضیح عن توحید الخلاق فی جواب اہل العراق للشیخ سلیمان بن عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب (ش ۱۲۳۳ھ) (مصر: ۱۳۱۹ھ)

۱۴۔ منہاج التقدیس دالتاسیس فی کشف شبہات داود بن جرجیس: للشیخ عبداللطیف بن عبدالرحمان بن آل الشیخ (ف ۱۲۹۳ھ) (بمبئی: ۱۹۰۷ء)

یہ صلح الاخوان کا جواب ہے۔

۱۵۔ صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیخ دحلان: للشیخ محمد بشیر السہسوانی (ف ۱۳۲۶ھ)
یہ کتاب عام طور پر مولانا محمد بشیر سہسوانی ہی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ ہمارے پاس جو نسخہ ہے، اس پر مصنف کا نام عبداللہ بن عبدالرحمان بن عبدالرحیم السندی درج ہے، غالباً یہ کسی مصلحت سے کیا گیا تھا۔

(یہ وہی نسخہ ہے جو شیخ اسحاق بن عبدالرحمان بن حسن کے استعمال میں رہا ہے)
(مطبع فاروقی دہلی ۱۸۹۰ء)

اس کا دوسرا ایڈیشن نہایت تصحیح و اہتمام سے المنار پریس مصر میں چھپا ہے (۱۳۵۱ھ) اور اصل مصنف کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ آغاز میں علامہ سید رشید رضا (ف ۱۳۵۴ھ) کا مقدمہ اور تعارف ہے۔

۱۶۔ البیان المبدی لشناعۃ القول المجدی: لسلیمان بن سحمان النجدی صیانۃ الانسان دحلان کی الدرر السنیۃ کا جواب ہے۔ جواب الجواب القول المجدی فی الرد علی عبداللہ

ملاحظہ ہو تراجم علمائے حدیث ہند، جلد اول ص ۲۵۵۔

بن عبدالرحمان السندی کے نام سے شائع ہوا۔ البیان المبدی، القول المجدی کی تردید میں ہے (امرتسر ۱۸۹۷ء) ج

۱۷۔ الصواعق الالٰہیۃ فی الرد علی الوہابیۃ: سلیمان بن عبدالوہاب النجدی الحنبلی (ف ۱۲۰۸ھ)

یہ رسالہ شیخ الاسلام کے بھائی سلیمان بن عبدالوہاب کا لکھا ہوا ہے۔ اور یہ گزر چکا ہے، کہ یہ بعد کو تائب ہو گئے تھے (۱۱۹۰ھ؛ ابنِ غنام: ج ۲ ص ۱۱) ـــ مخالف اس رسالے کا تو خوب ڈھول پیٹتے ہیں، لیکن "رجوع" کا ذکر نہیں کرتے۔ کتاب کا یہ نام غالباً بعد کو رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ سلیمان بن عبدالوہاب نے یہ رسالہ ۱۱۶۷ھ کے لگ بھگ ایک خط کی صورت میں لکھ کر اہلِ حریملا کے پاس بھیجا تھا، جس کا جواب بھی شیخ نے دیا تھا[1] اور ۱۱۶۷ھ میں یہ نام (وہابیۃ) قطعی طور پر رائج نہیں ہوا تھا۔ (مطبوعہ مصر: نامعلوم[2])

اصل رسالہ تو مختصر ہے، لیکن اس میں کچھ ضمیمے بھی لگا دیئے گئے ہیں اور یوسف وجوی وغیرہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ "یہ ضمیمے" اکثر و بیشتر ابنِ سعود کے عروج کے بعد تالیف ہوئے ہیں۔

۱۸۔ تہکم المقلدین فی مدعی تجدید الدین: محمد بن عبدالرحمان بن عفالق الاحسائی (تقریباً ۱۱۷۰ھ)

۱۹۔ فصل الخطاب فی رد ضلالات ابن عبدالوہاب: لاحمد القبانی البصری (تقریباً ۱۱۷۰ھ)

۲۰۔ الصواعق والرعود: لعفیف الدین عبداللہ بن داؤد الزبیری الحنبلی (ف ۱۲۲۵ھ) مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ: ۱۲۳۸ھ)۔

---

[1] روضۃ الافکار، ج ۲ ص ۴۳-۵۲

[2] ۱۳۲۸ھ کے بعد چھپی ہے۔ اتنا قطعی ہے۔

۲۱۔ مصباح الانام وجلاء الظلام: السید احمد عبداللہ الحداد باعلوی (مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ ۱۲۵۸ھ)

(۲۲) صلح* الاخوان من اہل الایمان وبیان الدین القیم فی تبرئۃ ابن تیمیہ و ابن قیم لداؤد بن سلیمان بن جرجیس البغدادی (ف ۱۲۹۹ھ)۔

اسی کی تردید میں شیخ عبداللطیف کی منہاج التقدیس لکھی گئی تھی۔ بمبئی ۱۳۰۵ھ آلوسی (ف ۱۳۱۷ھ) نے بھی جلاء العینین (ص ۳۱۵) میں مصنف صلح الاخوان کی غلط فہمیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۲۳۔ الدرر السنیۃ فی الرد علی الوہابیۃ: السید احمد زینی دحلان (ف ۱۳۰۴ھ)۔ یہ چھوٹا رسالہ ہے، جو دحلان کی خلاصۃ الکلام میں بھی پورا پورا آگیا ہے (ص ۲۶۱-۲۲۸)۔ اس کے جواب میں مولانا محمد بشیر سہسوانی نے صیانۃ الانسان لکھی، اور پھر اس پر حضرمی نے القول المجدی تصنیف کی۔ آخر میں سلیمان بن سحمان نے البیان المبدی لکھی۔ آخر دور میں یعنی گزشتہ ساٹھ ستر سالوں میں مفتی دحلان ہی کی کتابوں نے غلط بیانیوں کی زیادہ اشاعت کی ہے

۲۴۔ فتح المنان فی تزییف المداج وتزییف الزائف من صلح الاخوان لمحمد بن ناصر

۱؎ مولف مصباح الانام (جو تیرھویں صدی ہجری کے ایک عالم تھے) نے دیباچہ میں ایسی متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے، جو شیخ کی تردید میں لکھی گئی تھیں، لیکن ان کا ذکر کسی فہرست میں نہیں جیسے:

(۱) الصارم الہندی فی عنق النجدی للشیخ عطا المکی۔ (۲) رسالۃ للشیخ احمد المصری الاحسائی

مصباح الانام طبع بھی ہو چکی ہے (بروکلمن ج ۲، ص ۸۱۳) ۲؎ اتحاف النبلاء، ص ۴۱۳

* جن کتابوں پر یہ علامت ہے، وہ مجھے دستیاب نہ ہو سکیں۔

الحازمی النجدی (ف ۱۲۸۳ھ) ۔

یہ آخری کتاب بطور محاکمہ کے لکھی گئی ہے، جیسا کہ کتاب کے نام اور اتحاف کے اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے

چوں کہ ان میں سے اکثر کتابوں کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس لئے ماخذ کے سلسلے میں مزید تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یوں کافی چھان بین کی جائے تو یہ فہرست طویل ہو سکتی ہے [1]

ھذا اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ٥

---

[1] ان کتابوں کے علاوہ ضمنی طور پر مندرجہ ذیل تذکروں نے بھی وفیات اور دوسری تفصیلات کی تعیین میں بڑی مدد دی:۔

(i) سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر للمرادی

(ii) السحب الوابلۃ علی ضرائح الحنابلۃ (مخطوطہ مشرقی کتب خانہ) -- اس کا مصنف بھی شیخ کی اور ان کی دعوت کی مذمت میں حد اعتدال سے بڑھا ہوا ہے۔

(iii) معجم المطبوعات (سرکیس)

(iv) الاعلام للزرکلی (تین جلدیں)

(۷) جرمن مستشرق (C. Brockelmann) کی مشہور تاریخ ادب عربی۔
(Geschichte der Arabischen Litterature)
(دو جلدیں: ۱۸۹۹ء - ذیل کی دو جلدیں، ۱۹۳۰ء)
خاص کر ذیل کی دوسری جلد تو اس سلسلے میں اوڑھنا بچھونا رہی ہے۔

(۸) تقویم ہجری و عیسوی (انجمن ترقی اردو)

مصنّف کی دوسری کتابیں

- مولانا سندھی اور اُن کے افکار و خیالات پر ایک نظر
- ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک
- اشتراکیت اور اسلام
- دیارِ عرب میں
- ہندو پاکستان میں دعوت اسلامی کی تاریخ
- مکاتیبِ سلیمانؒ

"حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ تجدید کا یہ ایک زریں باب ہے۔ بارھویں صدی ہجری میں
ترویجِ جاہلیت کے خلاف محمد بن عبدالوہاب نے خلوص و للہیت کے ساتھ ایک کامیاب جنگ لڑی۔ اور
از سرِ نو صلاح و تقویٰ کی ایک نہر بہا دکھائی..... اس جہاد اقامتِ دین کی داستان اور اس کے قائد
کے احوال کو جناب مسعود عالم ندوی صاحب نے بڑی دیدہ ریزی اور چھان بین کے بعد جدید سائنٹفک
انداز سے مرتب کیا ہے اور اس سلسلہ کے ماخذ پر جرح و تعدیل کا نشتر چلا کر جوہر صداقت نکال لیا
ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے بہت سی نئی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں اور بہت سی پرانی غلط فہمیوں
کا ازالہ ہو سکتا ہے۔"

ماہنامہ "ترجمان القرآن"

"اس میں نجد کے مشہور مصلح امام محمد بن عبدالوہاب کی سوانح حیات، ان کی دعوت اور اس
کے اصول پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ غالباً اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔ جس میں اس جلیل القدر
شخص کے حالات کو یکجا کیا گیا ہے۔ جو اگرچہ نجد کے گمنام خطہ زمین سے اٹھا۔ مگر جس نے اپنی دینی
بصیرت سے تاریخ اسلامی میں انقلاب برپا کر دیا۔ تجدید و احیائے دین کی تاریخ میں غالباً یہی ایک
شخص ہے۔ جس نے اپنی دعوت کے ثمرات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ایک مستقل سٹیٹ اسلامی اصولوں
پر قائم کیا۔ مگر اس ادائے بے نیازی کے ساتھ کہ حکومت و سلطنت کے کاروبار پر حرص کی ایک نگاہ
غلط انداز بھی نہ ڈالی۔ اس کی یہ بے نیازی نہ صرف حکومت و سلطنت کے بارے میں تھی، بلکہ دینی و روحانی
سیادت کے معاملے میں بھی وہ اتنا خوش ذوق تھا کہ اس کا قلم اور زبان کسی قسم کے دعوے سے ملوث نہ ہوا۔
یہ کتاب ان تمام بدگمانیوں کو دور کرے گی۔ جو اس جلیل القدر داعیٔ حق کے متعلق پھیلی ہوئی ہیں۔"

سہ روزہ "کوثر"

طباعت سرور نوروز پریس اردو بازار لاہور